ہمارا ادب

۱۹۶۷ء

ایڈیٹر

محمد یوسف ٹینگ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

ہمارا ادب

۱۹۶۷ء

ترتیب:-

محمد یوسف ٹینگ

اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز سرینگر

طابع وناشر :
سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز

مطبع :
ڈیلائیٹ پرنٹنگ پریس سرینگر

تعداد : ۵۰۰

قیمت :

تاریخ اشاعت : مارچ ۱۹۶۸ء

(اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی)

ترتیب

(د) غزلیں:

(س) افسانے:

حرفِ اوّل

ہمارا ادب کے سلسلے کی تازہ کڑی پیش خدمت ہے

اردو ہماری ریاست کی سرکاری زبان ہے۔ اور اس کی بڑی وسیع وجوہات ہیں۔ تسلیم کہ ریاستی عوام کی یہ مادری زبان نہیں ہے لیکن یہ بھی تو صحیح ہے کہ ہمارے نچلے درمیانہ طبقے، درمیانہ طبقے اور اونچے درمیانہ طبقے (اعلیٰ طبقہ تو شاید ہمارے یہاں وجود میں نہیں آیا ہے) کیلئے اتنی مانوس ہے کہ وہ اسے اپنی عزیز متاع سمجھ کر اسے برتتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں۔ ہمارے دیہات میں بھی اردو بولنے سمجھنے اور لکھنے والوں کی بہتات ہے اور شاید ریاست کا کوئی کونہ ایسا نہیں جہاں اس زبان کی کتابوں اخبارات اور رسائل کی رسائی نہیں ہے۔ یہ زبان ریاست کی ان تین اکائیوں کے درمیان بھی ربط و اُنس کا سب سے اہم ذریعہ ہے جن کی جغرافیائی خصوصیات اپنے اپنے لحاظ سے انفرادی خدوخال کی مالک ہیں۔ ان تینوں منطقوں میں یہ زبان نہ صرف بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ یہ ان خطوں کے عوام کے درمیان تال میل کی زبان کی ذمہ داریاں بھی نبھا رہی ہے۔ ہماری ریاست اس وقت ملک کے نقشے پر اردو کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے اُبھر رہی ہے جسکا اپنا اسلوب اور اپنی مقامی رنگت ہے لیکن جسے اب نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔ ہندبھر میں اردو کی تحریک کو کشمیر میں اردو کی اس بڑھتی ہوئی اہمیت سے توانائی حاصل ہو رہی ہے اور اس کی آواز میں ایک نئی سنجیدگی پیدا ہو رہی ہے۔

تحریر کے میدان میں اردو نے مقامی طور پر صف اول کے ادیب اور شاعر پیدا نہیں کئے ہیں لیکن اس بات کو خاص تواریخی اور تمدُنی عوامل کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہیئے۔ کشمیری اونچے اونچے پہاڑوں کی دیواریں پھاند کر باہر گئے تو اقبالؔ، چکبستؔ، سرشارؔ، آغا حشر اور منٹو بن گئے کشمیر میں رہ کر اگر وہ اس پایہ قدو قامت حاصل نہیں کر سکے تو اس کی کچھ وجوہات ہیں اس میں کشمیر کی عام تعلیمی پسماندگی کا دخل ہے۔ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ ریاست میں اردو کی اصل تعلیم و تربیت کا سلسلہ صرف چند دہائیوں سے شروع ہوا ہے۔ اردو کے بڑے مراکز سے ہماری دوری کشمیریوں میں شوق سفر کی کمی، اردو کے علمی مرکزوں اور بڑے کتب خانوں کا ہماری رسائی سے باہر ہونا اور کتابوں کی خرید کے سلسلے میں ہماری کم استعدادی بھی اس کی دوسری

وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اور یہ بات بھی کہ کشمیر کے اردو ادیب کو بہت کم حوصلہ افزائی نصیب ہوئی ہے۔ اس میں اردو کے ان اجارہ داروں کے بخل اور تنگ نظری کو بھی دخل ہے۔ جنہوں نے بھی کشمیر کے لکھنے والوں کو التفات کے قابل نہ سمجھا اور ہمیشہ ان کی تخلیقات پر ناک بھوں چڑھائی۔ وہ اردو کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھتے رہے اور اردوئے معلّٰی کے نشے میں ان کی گردن غرور سے ایسے اکڑ کر رہ گئی کہ انہیں کشمیری ادیبوں کی تخلیقات کو اپنے انتخابات اور اپنے رسالوں میں جگہ دینے کی توفیق نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ کہ جہاں اردو کی ہمجولی زبانوں کا دائرہ محمود و ایاز کا فرق مٹ جانے سے وسعت پذیر ہو رہا ہے۔ وہاں اردو ان جگادریوں کے آستینوں میں سر چھپاتے ہوئے ہانپتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کشمیر کے اردو ادیب غالب اور انیس نہ سہی لیکن ان ہی کا ایک ساتھ پلا ہوا کرشن چندر تو ہے۔ کشمیری اردو ادیبوں کی اردو تخلیقات اس قابل ضرور ہیں کہ انہیں اردو کے قاضیانِ شہر ٹکسال باہر قرار نہ دیں۔

ہماری ریاست میں اردو کی ادبی کتابوں کی جسقدر مانگ بڑھ رہی ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو کی مقبولیت ہمارے یہاں اب بھی روز افزوں ہے۔ موجودہ حکومت نے صحافت پر احتساب کی گرفت ڈھیلی کرنے میں جس روشن خیالی کا ثبوت دیا ہے اس سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ ریاست میں ایک طاقتور پریس پنپ رہا ہے۔ مسرت کا مقام یہ ہے کہ صحافت کا یہ بڑا کارواں اردو اخبارات پر ہی مشتمل ہے۔ بلکہ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ ہماری ریاست اردو اخبارات کی اشاعت کے لحاظ سے ملک بھر میں دوسرے تیسرے نمبر پر ہوگی۔ حالانکہ یہ ملک کی سب سے کم آبادی والی اور کم تعلیم یافتہ ریاستوں میں ایک ریاست ہے۔ اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اخبارات کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کے قارئین کا حلقہ بھی وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور ظاہری حسن اور تحریری روایات دونوں معاملوں میں ان کا معیار روبہ ترقی ہے۔ کچھ اخبارات جن میں روزنامے اور ہفتہ وار دونوں شامل ہیں۔ برصغیر کے اچھے سے اچھے اردو صحائف کیساتھ ساتھ فخر کے ساتھ پڑھے جا سکتے ہیں۔ بعض کا دائرہ اشاعت تو ریاست کی حدود پھاند کر ملک بھر میں پھیل چکا ہے اور انہیں جگہ جگہ سراہا گیا ہے۔

یہ تمام امور ہمارے یہاں اردو کے درخشندہ مستقبل کی شہادت دے رہے ہیں۔ لیکن مقام تاسف ہے کہ ہمارے سبھی لکھنے والے "ہمارا ادب کو" اپنے فیض سے مالامال کرنے میں زیادہ سرگرم نہیں اور ہمیں بار باران کی چوکھٹ سے خالی ہاتھ لوٹنا پڑتا ہے۔ قدرتی طور پر یہ انتخاب

اس وزن و وقار سے محروم رہ جاتا ہے ۔ جو ان کی تخلیقات کو اپنے دامن میں سمو کر اسے حاصل ہو سکتا ہے ۔ حد یہ ہے کہ اردو کے بعض وہ ادیب جو بیرون کشمیر سے اردو کے نام پر یہاں تشریف لاتے ہیں اور اردو کی مظلومیت پر دلگداز آنسو بہاتے ہیں وہ ایک مقامی انتخاب میں شمولیت کو اپنی کسر شان اور سبکی سمجھتے ہیں ۔ اور بمبئی ، لکھنو ، اور لاہور کے رسایل کیطرف نظریں گاڑ دیتے ہیں ۔ یہ خود پرستی (یا خود غرضی ؟) اپنے اندر اس زبان کے حقوق پر دست درازی کے انداز رکھتی ہے جس نے انہیں گفتگو کا سلیقہ اور شہرت کا اعتبار بخشا ہے خدانخواستہ اگر اردو کو ان لوگوں کے سہارے پر زندہ رہنا پڑے تو اسے غالب کا یہ شعر گنگنانا پڑے گا ؎

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

بہر کیف ہم پہلے بھی مقامی اور مہمان دونوں قبیل کے ادیبوں کے سامنے دست سوال دراز کرتے رہے ہیں اور ایک اور بار ان کی توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ یہی کچھ ہمارے بس میں ہے ؎

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی

اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

محمد یوسف ٹینگ

مضامین

پروفیسر عبدالقادر سروری

کشمیر کے ابتدائی مختصر اردو قصے

کشمیر میں اردو مختصر قصے کی نوعیت کی کوئی چیز انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ملتی ہے۔ لیکن یہ مختصر قصے، جدید فنی نوعیت کے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ایک طویل داستان میں یہ ضمنی قصوں کے طور پر داخل کئے گئے ہیں۔ اس نوع کے قصے ہم کو کشمیر سے باہر بھی ملتے ہیں۔ مثلاً "فسانۂ عجائب" میں ایک ضمنی قصہ۔ "باغ و بہار" میں بھی چار بلکہ پانچ قصے ہیں، لیکن یہ قصوں سے زیادہ مختصر داستانیں ہیں۔ یہی نوعیت "آرائش محفل" کے ضمنی قصوں کی بھی ہے۔ داستانی طرز کے مختصر قصوں اور بعض داستانوں کے درمیان آنے والے مختلف قصوں میں کچھ تھوڑا سا فرق ہے۔ موخر الذکر قصے، مختصر افسانوں کی طرح کسی ایک مقصد کو پیش کرنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ "فسانۂ عجائب" کے پر مطلن کا قصہ اسی نوعیت کا ہے۔ رجب علی بیگ سرور ہی نے کچھ اور قصے "فسانۂ دلپذیر" کے عنوان سے لکھے تھے لیکن سرور نے اسے

اپنے مخصوص انداز سے بیان کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اردو کلاسیکی قصوں کا رنگ اس میں پیدا ہو گیا ہے اس کے باوجود یہ اردو کے اولین جدید فنی افسانوں میں شمار ہو سکتا ہے۔

کے قصے کی نوعیت کے قدیم قصے جو کشمیر میں ملتے ہیں، وہ "فسانۂ عجائب" ہی کے نمونے پر لکھی ہوئی ایک داستان "داستان جگت روپ" میں ملتے ہیں، جو پنڈت سالگرام کول سالک کی تصنیف ہے جس کا مختصر تذکرہ میں نے اپنی تصنیف "کشمیر کے اردو ادیب ـ دو بھائی" میں کیا ہے اور اس کے خاکے اور اس کے فن پر ایک تفصیلی مضمون "آجکل" (دہلی) میں شائع کیا ہے۔ سالک کی داستان جس کے کچھ اجزا ناقص ہیں، ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔

سالک کشمیر کے پنڈتوں کے معزز گھرانے سے تھے، اور کم و بیش حالی اور شبلی کے معاصر ... تے ہیں۔ ان کے بھائی پنڈت ہرگوپال کول خستہ بھی اردو کے شاعر اور مصنف تھے۔ وہ "گلدستۂ کشمیر" جو کشمیر کی تاریخ پر ہے۔ اور ایک قصے "گلزار نورید" کے بھی مصنف تھے۔ انہوں نے کچھ غزلیں اور کئی مثنویاں لکھی تھیں جن میں

سے ایک "ہیمہ مال اور ناگ رائے" شائع ہوئی تھی، لیکن اب کمیاب ہے۔ ان کی مثنوی "گوپال نامہ" اور ایک اور نظم "نرسنگھ اوتار" شائع نہیں ہوئیں، اور اب دستیاب بھی نہیں ہوتیں۔ خستہ نے اپنا تخلص، غالب کے چہیتے شاگرد، منشی ہرگوپال تفتہ کے بالمقابل اختیار کیا تھا۔

پنڈت سالگرام، مذہب، اخلاق، قانون، ادب اور لغات پر اُردو اور کشمیری میں کئی تصانیف کے مصنف ہیں۔ ان کی ایک مثنوی "سندر بدن" کے بارے میں میرا ایک مضمون "نذر عرشی" کے مجموعے میں شائع ہوا ہے۔ کشمیر کی سرزمین، اور چیزوں کے علاوہ لوک نظموں، قصوں، کہانیوں اور داستانوں سے مالا مال ہے۔ لیکن بہت سی کہانیاں ابھی سینوں میں محفوظ ہیں۔ دو داستانیں کشمیر کی گویا قومی داستانوں کی اہمیت اختیار کر چکی ہیں۔ ایک "ہیمہ مال ناگ رائے" کی داستان اور دوسری "گلریز" کی داستانِ محبت۔ ان میں سے ایک "ہیمہ مال ناگ رائے" قدیم تر عہد کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اور "گلریز" ایران کی تہذیب، اور شائستگی کے کشمیر پر اثر کی غماز۔

پنڈت سالک رام سالک کی "داستان جگت روپ" دیوؤں، پریوں اور عجیب عجیب مافوق الفطرت مخلوقات کی داستان ہے، جن میں ناگوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ناگ، کشمیر کی فوق فطری قومی مخلوق ہے اور کشمیری ادب میں یہ لوگ بھی ہیں اور سانپ بھی۔ ان کے لوگ یا قوم ہونے کا تصور، کشمیر کی داستان پاستان سے ماخوذ ہے، اور سانپ کا تصور، ناگ کے نام سے ملحق۔ اس طرح کشمیری داستانوں میں یہ عجیب مخلوق بہت اہم رول ادا کرتی ہے اور ان سے سالک نے بڑے وسیع پیمانے پر کام لیا ہے۔

مختصر قصے جو "داستان جگت روپ" میں آئے وہ (۷) ہیں۔ اصل قصہ۔ جو جگت روپ نے ذوق و نظر کی مہمات پر مشتمل ہے، اس سے ہٹ کر یہ سات ضمنی قصے محض قصہ گوئی کی خاطر کہے گئے ہیں، اور ان کا اصل داستان سے کوئی عضوی تعلق نہیں ہے۔ یہ قصے حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک مفلس برہمن کا قصہ

(۲) ایک جوتشی کا قصہ

(۲) عقلمند برہمن کا قصہ

(۳) دھرم و کرم کے قضیہ کا قصہ

(۴) دولت بیگ تاجر ایرانی کی داستانِ محبت

(۵) موتی لال، ساہوکار کا قصہ

(۶) وفادار سوداگر بچی کا قصہ

(۷) ایک شہزادہ وزیر زادے اور سوداگر کی بیٹی کا قصہ۔

مُفلس برہمن کا قصّہ

چونکی مار کر جونکی میں چونکی پر بیٹھ جاتا ہے. کم بخت مرتا بھی نہیں کہ آس تو چک جائے. ہاتھ پیر ہلانے سے جان نکلتی ہے. گویا سو برس کا بیمار ہے. کھانے کا نام سُن لے تو ہاتھ دھو کر زہر کھانے کو بھی تیار رہے. بجب اس بیچارہ مصیبت کے مارے نے اس بد خو، زشت رو کی یہ گفتگو درد بدستی تو نہایت شرمندہ و پشیمان ہوا، اپنی شکل سے بیزار ہوا. تیغ زباں گھاؤ کر گئے، بولی تھی کہ گولی تھی، جگر پر داغ پہ داغ دھر گئے، کلیجہ کاٹ گئے. لخت دل کو ہیرے کی کنی اور پارہ الماس کی طرح چاٹ گئے. بولا کہ اے بھاگوان تو اپنی زبان کو مُفت خراب کرتی ہے ایسی سخت مصیبت میں تو اور بھی عذاب کرتی ہے. اے نادان، خیال تو کر، میری کیا اختیاری، خدا کا کون شریک ہے، اصل میں یہی مرضی پروردگار ہے. پھر زبان کو گندہ کرنے سے کیا سُود ہے. اپنی طرف سے کون کم گندا رہا ہے لیکن ایک کون شخص ہے، جو کرموں کی لکیر پہ میکھ مارتا ہے. بخت اگر یاری نہ کرے تو پھر کوئی کیا کرے. مولف:

نہ کر گریہ و زاری باری باری　　نہ بار آور ہے یہ کچھ آبکاری
جو بیلی کھیتی ہے، کب وہ ہری ہو　　ہری بخشے نہ جب تک آبداری
خزاں جس باغ میں ہو داغ لالہ　　مٹائے کب اسے یاد بہاری
کرے نہ گر قضا کا زرگری جو　　تو رشوت دیتی ہے کب زور و تاری
قضا جب وار دی سم دے چکی ہو　　شفا کب دے سکے پرہیزگاری
غم و راحت میں مت ہو شاد و غمگیں　　ہر اک شے رکھتی ہے موقع و باری

یہ اشعار پڑھ کر بولا کہ شائد تو نے ایک جوتشی کا قصّہ نہیں سُنا ہے. وہ تو جلی بھُنی بیٹھی تھی. گو اس کی میٹھی میٹھی اداگیان کی باتوں سے غصّہ کی آگ قدرے سرد ہوئی مگر تاہم ناک بھوں چڑھا کر بولی کہ اگر کچھ بکنا ہے تو بک نہیں تو ناحق کیا ٹیں ٹیں لگائی ہے. وہ تو دریا دل تھا، اس کی تنگی ترشی سے بالکل خفا نہ ہوا اور بولا کہ اے نیک بخت ذرہ غیض و غضب کو دل سے دُور کر، ادب سیکھ، شعور کر اور سُن کہ دکھن کے کسی شہر میں ایک جوتشی پنڈت بڑا گیانی تھا؟

آگے جوتشی کی کہانی شروع ہوتی ہے، جو نہایت دلچسپ ہے. جوتشی بڑا گیانی تھا اور لوگوں کو ان کے ماضی اور مستقبل کا حال بتاتا تھا، زمین کے خفیہ خزانوں کی اسے خبر تھی، لیکن اس کی قسمت برگشتہ تھی کچھ ہاتھ نہیں آتا تھا. خزینوں کی تلاش میں جاتا. اور انہیں پا بھی لیتا، لیکن پھر کھو دیتا. برہمن کی بیوی یہ سارا قصّہ سُن کر، خود اسے ایک عقلمند برہمنی کی کہانی سُناتی ہے، جو اپنی عقلمندی سے اپنے مقسوم کو بدل دیتی ہے.
بیوی سے عقلمند برہمنی کی کہانی سُن کر، برہمن بہت بدمزہ ہوا. آگے سالک کی زبانی ہی یہ داستان

سُنائی جاتی ہے :

" ایسے ایسے روکھے سوکھے گرم فقرے سُن کر برہمن کے عیش شیریں تلخ ہو گئے ، جی ان نمک ریز باتوں سے کھٹا ہوا ، لب خشک ہوئے ، دل ٹھنڈا ہوا ۔ دریائے عرق میں غرق ہوا ۔ زبان کا مزا پھیکا ہوا ! جی میں تیاگ اور ویراگ آ گیا ، دل میں سمجھا کہ اس بے عزّتی سے تو مرنا ہی بہتر ہے ، ورنہ روز کون لڑے ، گھر بار چولہے پڑے یہ خیال کر کے ۔ ایک پھٹی پرانی پگڑی کے دو تین لٹ پٹے پیچ لپیٹ اور بابا آدم کے وقت کی ایک سوتلی دو ڑی سمیٹ نوح کے وقت کی دھوتی کا ایک کپڑا بغل میں جھولی کو لٹکا ایک ہاتھ میں پیتل کی لوٹیا ۔ دوسرے میں لٹیا ، غصّے کی طراری کے باد پا پہ سوار ، بڑی چال اور بانکی ڈھاری برہنہ پا دپیادہ موت کا آمادہ ، بے سرو سامان و پریشان خستہ جان وخراب وخوار لکڑی کی ٹیک سے لڑکھڑاتا چلا ۔ پھر تو اس عورت نے بھی روکا ، مگر قلندروں اور بندروں کا سا کھیل ہو گیا ۔ بوڑھے بابا رو ٹھ گئے ۔ آخر جنگل کی راہ لی ۔ اور گھر بار کے خیالات چھوٹ گئے ۔

پروفیسر محمد ابراہیم

مرزا بدخشی کشمیری کے صوفیانہ معتقدات

تصوف "صوف" سے ماخوذ ہے جس کے لفظی معنی صوف اور پشمینہ کے ہیں۔ اصطلاح میں تصوف صاف باطنی اور قلبی صفائی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ پند نامے میں خواجہ فرید الدین عطار نے تصوف کے یہ دونوں معنی اپنے اس شعر میں بڑی خوبی کے ساتھ جمع کر دیے ہیں ؎

ہمچو صوفی در لباسِ صوف باش　　　وز صفت ہائے خدا موصوف باش

کشمیر کے عارف باللہ حضرت مرزا اکمل الدین المعروف مرزا کامل بیگ تصوف کی لفظی اور معنوی دونوں خوبیوں سے بخوبی متصف تھے۔ پشمینہ پوشی اور زہد و اتقا اُن کا شعار تھا۔ یہ امر کہ وہ خود بھی صوفی تھے، اس کا اندازہ اُن کے حسب ذیل شعر سے ہوتا ہے۔

بہر صوفی است ایں ہمہ سازم　　　صوفی گو کہ خوب بنوازم

عام صوفیوں اور زاہدوں کی طرح مرزا کامل بیگ کو زہد و معرفت کے ستون خواجہ فرید الدین عطار اور مولانا جلال الدین رومی سے خاص عقیدت تھی اور در حقیقت الٰہی بزرگوں کی نظر نے انہیں صوفیت کے درجے پہ پہنچا دیا تھا۔ بحر العرفان میں اس طرح فخر و مباہات کا اظہار ملتا ہے۔

از مریدانِ شیخِ عطارم　　　استعانت ز مولوی دارم

علاوہ ان بزرگانِ کرام کے حضرت مرزا صاحب خواجہ حبیب اللہ عطار گانی کے مریدانِ با اخلاص سے تھے۔ عمر کے ایک طویل حصے تک آپ نے اپنے پیر طریقت کی خدمت بجا لا کر خلافت کا عہدہ حاصل کر لیا تھا۔ بدایوخان کے مختلف مقامات پر اُس بے پناہ محبت کا اندازہ ہوتا ہے جو حضرت مرزا کامل صاحب کو اپنے پیر طریقت سے تھی۔ درج ذیل بیان کے مطابق مثنوی بحر العرفان کا سبب تالیف بھی یہی خواجہ حبیب اللہ عطار علیہ الرحمتہ ہیں۔ بقول مرزا صاحب یہ بزرگ اُمّی ہونے کے باعث ایک ایسے آدمی کے متلاشی تھے جو تصوف رموز و کنایات بزبان فارسی بیان کر سکے۔ خوش قسمتی سے مرزا صاحب اس وصف کے حامل ہونے

کے باعث اس اہم کام کے اہل قرار پائے بحرُ العرفان کی تنظیم کے سلسلے میں مرزا صاحب نے ان اشعار میں آپ کی تحریک و ترغیب کا اعتراف کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

یک شے چشم من بُنی خوابیدہ　　بود بیدار خواب ہامی دید
ناگہاں گشت مرشدم پیدا　　نے بشر بود بلکہ بود خدا
از ازل نام او حبیب اللہ　　از ہمہ نیک دید دلش آگاہ
چوں بدیدم بپائش افتادم　　بوسہ برخاک پائے اودادم
چوں شوی مرشد و بحق عارف　　من مریدم بکن مرا واقف
گفت ایں شور بحر عرفانست　　ہر کہ در ایں فتاد حیرانست
پیاش ازیں من نگفتمت سی سال　　کہ مرا آنچہ حاصلت احوال
امّی ام نیست قدرتِ تحریر　　کز زبانِ قلم کنم تفسیر
چوں ترا دادہ اند خطّ د سوا و　　کن رقم از برائے اہل وداد
در زماں کن رقم بہ اقلامش　　"بحرِ عرفاں" گذاشتم نامش

مرزا کامل بیگ کے صوفیانہ اعتقادات سمجھنے کے لئے اُن کی تصنیفات سے خاص طور پر مدد ملتی ہے۔ اِن کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ اس سلسلے میں ان کے خیالات روائیتی اور وہی کچھ تھے جو ایک مدّت سے طبقۂ صوفیاء میں چلے آتے تھے۔ تاہم ان کا تفصیلی اور انفرادی بیان کسی حد تک ذیل میں کیا جاتا ہے:-

وحدت الوجود فارسی کے "ہمہ اوست" کا مترادف ہے۔ یہ نظریہ فارسی کے صوفی شعراء کا ایک محبوب اور دلپسند مشغلہ ہے۔ درحقیقت وحدت الوجود صوفیت کا محور و مرکز ہے۔ وحدت الوجود کے نظریہ کا معتقد اپنی ہستی کو "موتوا قبل ان تموتوا" کے پیش نظر فنا کر کے ذات باری کا ایک ناقابل انفکاک حصّہ بنا دیتا ہے۔ مسلمان صوفیوں میں یہ عقیدہ بہت قدیم سے ملتا ہے۔ چاہے اس کا سبب ہندومت کی تعلیم ہو۔ یا خود اسلامی نظریات کا اثر، بہرحال اسلامی تصوف میں یہ نظریہ نہائیت قدیم ہے۔ وحدت الوجود کا مرتبہ چونکہ ذاتِ باری میں فنا ہو کر حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے دوسرے الفاظ میں اسے "فنا فی اللہ" کا عقیدہ بھی کہتے ہیں۔ مثنوی بحرالعرفان، اور مرزا کامل صاحب کی دیگر تصانیف میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں واضح طور پر اس نظریے کی تعلیم و تلقین ملتی ہے۔ ذیل میں چند مثالیں مرزا صاحب کی تصانیف سے پیش کی جاتی ہیں:-

آن عزیزان که حق پرستارند   هیچ به غیر ازین نه پندارند
دمبدم در فنائے خود کوشند   جام عرفان حق همی نوشند
هر که شد محو فانی فی الله   خیر و شر را در آن نه باشد راه
هر که تسلیم هست درویش است   رشته است او ز هستی خویش است
هر که عارف شد این قدم دارد   چشم بر لوح و بر قلم دارد
تا که هستی است خیر و شر باشد   در فنا عالم دگر باشد

کسے کو ساغر سرشار نوشید   حرارت از زبان وز روئے جوشید
نمی ماند نهان راز دل او   که در جوش از شراب آمد گل او
چو هستی مرد را از خود ستاند   شراب بیخودی در وے نماند

سلسله بگسل و خدا می جو   تا نماید راهت از هر سو
فانی باید از همه آزاد   بے مراد و مراد او ارشاد
فارغ از قید دام چون و چرا   غل و زنجیر از سر او وا
گر نه زنگ و نه حال داری تو   سر بدعوی چه می برآری تو
قادری قادری شود آنگاه   خود شود "لا" و ماند "الا الله"
آن عزیزان که حق پرستارند   هیچ به غیر ازین نه پندارند
دمبدم در فنائے خود کوشند   جام عرفان حق همی نوشند
چه زنی لاف حرف درویشان   ترک دنیا نمی کنی چو ایشان

از غزلیات

یار ما بهر محفل آرائی   خود تماشا و خود تماشائی
نفی کن نفی را تو هر ساعت   تا ز کثرت بوحدت آسائی

ہر چہ بینی بگو ہمہ ہست | تا بگویم تراکہ بینائی
روئے رد کرد دعویٰ | موئے رد کرد کفنہ آرائی
خود بباز از محفل آراست او | خود بہر کس رفیق تنہائی

عشق صوفیانہ شاعری میں عشق و محبت کو زبردست دخل حاصل ہے۔ اس معاملے میں صوفی شعرا محبوب حقیقی یعنی ذات باری کو سب کچھ سمجھتے ہوئے اسی کی محبت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ یہ عشق کہنے کو تو ایک لفظ ہے، لیکن اس کی تہ میں معنی کا دریا پنہاں ہے۔ اسی کے باعث سالک دُنیا اور مافیہا کو ہیچ سمجھکر سب کچھ مرضی مولا کے سپرد کردیتا ہے۔ عشق ہی وحدت الوجد، توکل، قناعت اور صبر کی تلقین کرتا ہے۔ اس چیز کے پیش نظر متصوف راہِ سلوک میں اس جذبے کو عارف کی بنیادی اور حقیقی چیز سمجھتا ہے اور جب تک اس کا دل منبع اُلفت نہ ہو تب تک اُسکے لئے واصل بہ حق ہونا ایک امر محال ہے۔ مرزا کامل بیگ کے صوفیانہ معتقدات میں عشق و محبت کے جذبے کو بنیادی مقام حاصل ہے جس کی وضاحت ذیل اقتباسات سے ہوتی ہے۔

جبرئیل امیں براق آورد | تا ازیں خاکداں بروش بُرد
شد بمرکب ز عشق اسوار | گشتہ زاں تیز گام رہ گذار
شد بمغرب دردنِ جلوۂ خاص | بود ازاں سوئے عشق ازیں اخلاص
زیں سبب شور عشق شد پیدا | تا باصل خود عکس شد پیدا
نمک حسن عشق را بنواخت | عشق ازاں شور درجہاں انداخت

عقل می گفت ... مرا طاقت نیست | عشق می گفت منت راہبر اُستادم
رستن از ہستی خویش ... استعداد ہمیں نما | نیستی راہ بمعراج حقیقت دادم
صوفی از خویش چو فانی شود آں معراج است | نیست شوتا تو بہ بینی کہ چہ شد رو دادم

زجام عشق آں دلدار مستم | بحمد اللہ عجب ہشیار ہستم
شہید خنجر مژگانِ یارم | میانِ کشتگاں بسیار ہستم
بہ نعمت ہائے الواں نیست میلم | چو اکمل از پئے دیدار ہستم

مرزا اکمل کے تصوف کی دیگر خصوصیات دُنیا کی بے ثباتی، طہارت یقین، بے خودی و وجد اور توکل و قناعت ہے۔ ذیل میں ہر ایک کی ایک ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

دنیا کی بے ثباتی

بود روزے مسیح در دشتے / فیض را بطِ حسن رومی گشتے
دید آنجا زنے بہ رعنائی / رہزنِ طاقتِ شکیبائی
کرد در بر لباس عروس آسا / تا شوند ابلہاں برو شیدا
در یکے پیرہن ہزاراں رنگ / ناظرانِ دلِ اہل بے رنگ
ہر یکے دادہ دل بیک رنگے / ہم دگر ضد ہم بیک چنگے
دست در دست با یکے شوہر / بود در دست دیگرش خنجر
ہم جوانے بخاک آلودہ / مردہ افتادہ پیش ردیودہ

. . . .

کرد از زن سوال روح اللہ / کیستی کن مرا ز خویش آگاہ
گفت دنیا مرا ہمی گویند / ایں جواناں اسیر جادوئیند

. . . .

خاک روبے بناں جو شد محتاج / محنت و رنج را شدہ آماج
زیر بار عیال فرسودہ / روزے از عمر خود نیاسودہ
او و اطفال او ہمہ عریاں / نے لباسے میسرش نے ناں
یک شبے جلوہ گر شدش دنیا / با جمالِ خوش و قدِ رعنا
گفت دنیا است نام من اے مرد / آمدم تا غنیمت خواہم کرد
گفتش اے خوشنمائے بد انجام / بہ مرا با تو گر ترا انم کام
من ز امروز از تو بیزارم / دور شو تا خدائے نگذارم

طہارتِ یقین و صفائی قلب

حضرتِ بو حنیفہ آں دیندار / کرد در علم جہد ہا بسیار
عالم از نورِ علم روشن کرد / راہ دین صاف و بے شک و ظن کرد
در طہارت شک از یکے ارکاں / شد چہل سال بعد ازاں از جاں

از سر نو نماز ہا را کرد | عاجزی اندراں خدا را کرد
در عبادت تو جہد کن بسیار | جز خدا دل بجا صلے گلذار
شکر للہ چہ خوش امت دولت مادر زادم | تا دریں منزل ویرانہ چنیں آبادم
چوں بدیدم دو جہاں را کہ سواد الوجہند | چشم پوشیدم و بر ہر دو نظر تکشادم
سر پا از زانوئے خود ماندم در ختم در فکر | دل معلم شد و تعلیم تصوف دادم

مرزا کامل تصوف کو اُن کا خالی اور بے ہودہ مشغلہ نہیں خیال کرتے، بلکہ اس میں وہی لذّت اور لطف محسوس کرتے ہیں جو ایک حقیقی عاشق کو معشوق کی محبّت میں ہوتا ہے۔ بلاشبہ مرزا کامل بیگ کا تصوف بالکل ایک روائیتی شے ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں روائیت سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا ہے اور اس کے تصوف کا ماحصل وہی کچھ ہے جو طبقہ صوفیا، میں قدیم سے مروّج چلا آیا ہے، تاہم اس بارے میں اُن کے کلام کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک پختہ مغز صوفی صاف طینت تھے۔ انہوں نے اساتذہ کے اصولوں کو نہ صرف وفاداری کے ساتھ برتا بلکہ ان کے پرچار کی بھی جان توڑ اور انتھک کوشش کی۔

ڈاکٹر اکبر حیدری

خواجہ احسن اللہ بیانؔ کشمیری

خواجہ احسن اللہ نام اور بیانؔ تخلص۔ بیانؔ کے نام میں اختلاف ہے۔ قائمؔ[1]، گردیزی[2]، حسنؔ[3]، شاہ محمد حمزہ مارہروی[4]، شورش[5]، عشقی[6]، شیفتہ[7]، اسپرنگر[8]، ناسخ[9]، مولوی عبدالجبار خان صوفی ملکاپوری[10]، لالہ سری رام دہلوی[11]، علی حسن خان[12]، مولوی عبدالحی[13]، کیفی چریاکوٹی[14] عسکری[15] ان کا نام خواجہ احسن اللہ بتاتے ہیں۔ حیرت[16]، یکتا[17]، سرور[18]، بیل[19]، ذکا[20]، قاسم[21]، شوق رامپوری[22] اور عشقی[23] نے خواجہ احسن الدین خان لکھا ہے۔

---

٥ عمدۂ منتخبہ ص ۴۲ سرور، مجموعہ نغز ص ۱۲۳ جلد اول قاسم، اسپرنگر اودھ کیٹلاگ ص ۲۱۲، عیار الشعرا قلمی خطا، خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۶۱۷، تاریخ ادب اردو ص ۲۶۲ عسکری، طبقات سخن قلمی مولفہ محی الدین قریشی۔

۱ مخزن نکات ص ۱۴ قیام الدین محمد قائم، قائمؔ چاندپوری۔

۲ تذکرۂ ریختہ گویاں ص ۲۷ سید فتح علی حسینی گردیزی

۳ تذکرۂ شعرائے اردو ص ۲۶ میر حسنؔ۔

۴ فص الکلمات قلمی ص ۱۸ شاہ محمد حمزہ مارہروی (نوشتہ ۱۱۹۷ھ)

۵ تذکرۂ شورش ص ۸۳ مرتبہ کلیم الدین احمد

۶ تذکرۂ عشقی ص ۸۴ شیخ وجیہہ الدین عشقی

۷ گلشن بیخار ص ۴۵ مولفہ شیفتہ (مترجمہ نفیس اکیڈمی کراچی)

۸ اودھ کیٹلاگ ص ۲۱۲ اسپرنگر

۹ سخن شعرا ص ۷۰ مولوی عبدالغفور خان نساخ

۱۰ محبوب الزمن ص ۳۰۸ جلد اول

۱۱ے خمخانۂ جاوید صہ ۶۱۷ جلد اول

۱۲ے بزم سخن صہ ۲۴

۱۳ے گل رعنا صہ ۱۹۲

۱۴ے جواہر سخن صہ ۲۹۳ مولوی محمد مبین چریاکوٹی۔

۱۵ے تاریخ ادب اُردو صہ ۲۶۲ عسکری

۱۶ے مقالات الشعرا، قلمی (نوشتہ ۱۱۷۴ھ مطابق ۶۱-۱۹۶۰ء) صہ ۱۴ ب قیام الدین حیرت

۱۷ے دستور الفصاحت صہ ۸۲ مولفہ احد علی یکتا (نوشتہ قبل ۱۲۱۳ھ) مرتبہ امتیاز علی عرشی۔

۱۸ے عمدۂ منتخبہ صہ ۱۴۴، ۱۹ے بیوگرافکل ڈکشنری صہ ۹۸

۲۰ے تذکرۂ عیار الشعرا قلمی خوب چند ذکا

۲۱ے مجموعہ نغز جلد اوّل صہ ۱۲۴ حکیم قدرت اللہ قاسم

۲۲ے تکملۃ الشعرا قلمی۔ کتب خانہ رامپور (نوشتہ ۱۱۹۱-۱۲۱۳ھ) مولوی قدرت اللہ شوق۔

۲۳ے طبقات سخن قلمی مولفہ شیخ غلام محی الدین عشق

مبتلا[۱] اور عاشقی[۲] صرف احسن اللہ بتاتے ہیں۔ لطف[۳] احسن اللہ خان اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں[۴] احسان اللہ لکھتے ہیں۔ مصحفی[۵] خواجہ احسن الدین کہتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ بیاں کا نام احسان اللہ تھا۔

بیاں کی جائے پیدائش میں بھی اختلاف ہے۔ میر حسن[۶] سرور[۷]، شیفتہ[۸]، عشق[۹]، ناسخ[۱۰] علی حسن خان[۱۱]، سری رام[۱۲]، مولوی عبد الجبار[۱۳] مولوی عبد الحی[۱۴]، عسکری[۱۵] کیفی چریاکوٹی[۱۶] ان کی جائے ولادت دہلی بتاتے ہیں۔ برعکس اس کے شفیق[۱۷]، گردیزی[۱۸]، مبتلا[۱۹]، شورش[۲۰]، شاہ محمد حمزہ[۲۱]، حیرت[۲۲]، لطف[۲۳]، اسپرنگر[۲۴]، بیل[۲۵] آگرہ بتاتے ہیں۔ اسپرنگر کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ قائم نے لکھا ہے کہ بیاں ساکن آگرہ تھے۔ اصلیت میں قائم ان کی جائے ولادت کے بارے میں خاموش ہیں[۲۶]۔ انہوں نے انہیں دہلوی یا اکبر آبادی ہرگز نہیں کہا ہے۔

بیاں خوش خلق پاکیزہ سیرت ظریف طبع اور لطیف مزاج تھے حسن صورت وسیرت کی دولت سے مالا مال تھے گفتگو نرم وشیریں ہوتی تھی۔ زبان ان کے حسن اخلاق کی تعریف کرنے سے قاصر ہے۔[۲۷]

۱ے تذکرہ گلشن سخن صہ ۶۸ مولفہ مردان علی خان مبتلا لکھنوی (۱۱۹۴ھ) مرتبہ مسعود حسن رضوی۔

۲؎ تذکرہ عشقی صـ۸۴

۳؎ گلشن ہند صـ۶۵ مرزا علی لطف

۴؎ اُردو غزل صـ۱۶۵ ڈاکٹر یوسف حسین خان

۵؎ تذکرۂ ہندی صـ۳۶ مصحفی

۶؎ تذکرہ شعرائے اُردو صـ۲۶، ۷؎ عمدہ منتخبہ صـ۱۴۴ ۸؎ گلشن بیخار صـ۴۵

۹؎ تذکرۂ عشقی صـ۸۴، ۱۰؎ سخن شعرا صـ۷، ۱۱؎ بزم سخن صـ۲۴

۱۲؎ خمخانۂ جاوید صـ۶۱۷ جلد اول

۱۳؎ محبوب الزّمن جلد اول صـ۳۰۸

۱۴؎ گل رعنا صـ۱۹۲

۱۵؎ تاریخ ادب اُردو صـ۲۶۲ عسکری

۱۶؎ جواہر سخن جلد اول صـ۲۹۳

۱۷؎ چمنستان شعرا صـ۵۲ رائے لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی

۱۸؎ تذکرۂ ریختہ گویاں صـ۲۷، ۱۹؎ گلشن سخن صـ۶۸

۲۰؎ تذکرہ شورش صـ۸۳، ۲۱؎ فص الکلمات صـ۱۸، ۲۲؎ مقالات الشعرا صـ۱۴ب

۲۳؎ گلشن ہند صـ۶۵

۲۴؎ اودھ کیٹلاگ صـ۲۱۲

۲۵؎ بیٹوگرافکل ڈکشنری صـ۹۸

۲۶؎ مخزن نکات صـ۴۷

۲۷؎ چمنستان شعراء صـ۵۲

وہ بڑی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست کے مالک تھے۔ دوستوں سے بڑے اخلاق و تہذیب اور شگفتہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ حیرتؔ ان کے حسن اخلاق و شرافت سے بے حد متاثر ہو کر لکھتے ہیں:۔

"بیان مجمع خوبی ہائے بیشمار است۔ و معدن مکارم ہزاران ہزار۔ برائے صاحب خداوند خیلی اتحاد و ارتباط دارد۔ ہنگامی کہ رین زلہ ربائے مائدۂ ارباب سخن بہ مقتضائے قسمت آب و دانہ دارد شاہجہان آباد بود، تفقد آن بزرگ منش زیادہ از آنچہ کہ متصور شود بحال خود مشاہدہ می نمود۔ حسن خلق و وفور مروت با علوی ادراک و رسائی طبیعت در طینت او مجمع است"۔ ۲؎

بیاں آں مرد عاشق پیشہ تھے[۳] شوق رامپوری انھیں صاحب ذہن سلیم و طبع مستقیم کہتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ (بیاں) شاہجہاں آباد میں عالمگیر ثانی[۴] کے عہد تک اقامت گزین تھے۔ اس کے بعد معلوم نہیں کہ کہاں گئے۔ شاہ محمد حمزہ[۶] کہتے ہیں کہ ۱۱۸۴ھ میں وہ نواب وزیر غازی الدین خاں کے ساتھ ان کے گھر ماہرہ میں گئے تھے۔ قائم لکھتے ہیں اس سے قبل وہ

---

۱ حیرت - قیام الدین نام، حیرت تخلص ابن شیخ امان اللہ اکبرآبادی۔ انھوں نے ریاض الشعرا مولفہ والہ داغستانی، مجمع النفائس آرزو اور سفینۂ شوق رائے رتن سنگھ رائے کی مدد سے مقالات الشعرا تالیف کیا۔ مقالات الشعراء تذکرہ کا تاریخی نام ہے جسے ۱۱۷۴ھ ہجری نکلتے ہیں۔ مقالات الشعرا ۱۵۹ فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے مولف تذکرہ دیباچے میں لکھتا ہے کہ

"جب ہندوستان میں احمد شاہ ابدالی کی پہلی بار پھیلائی ہوئی قتل و غارت (۱۱۷۰ھ) کی آگ بجھی خوش بختانہ مجھے مذکورہ بالا تذکروں کے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ دل میں آیا کہ عہد اورنگ زیب عالمگیر سے عالمگیر ثانی تک جو شاعر گذرے ہیں ان کے حالات پر مشتمل ایک کتاب ترتیب دوں" کلمات الشعرا کا ایک مخطوطہ کتب خانہ رامپور میں ہے۔

۲ مقالات الشعرا قلمی ص ۱۴ ب، ۳ گلشن سخن ص ۶۸

۴ عالمگیر ثانی، عزیز الدین نام جہاندار شاہ کا بیٹا تھا ان کی ماں کا نام انوپ بائی تھا وہ ۱۰۹۹ھ مطابق ۱۶۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۱ شعبان ۱۱۶۷ھ مطابق ۲ جون ۱۷۵۴ء کو احمد شاہ کی معزولی کے بعد عماد الملک نے قلعہ دہلی میں انھیں تخت نشین کیا اور پھر اسی شخص نے پانچ برس کی برائے نام حکومت کرنے کے بعد ۸ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۳۵۹ء کو قتل کر دیا (بیل ص ۴۹)

۵ تکملۃ الشعرا ص ۶۳

۶ شاہ محمد حمزہ مولف فص الکلمات - حمزہ کا انتقال ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۴ء میں ہوا فص ان کا کشکول ہے جس میں مذہبی، تصوفی، تاریخی اور ادبی معلومات کا عظیم الشان ذخیرہ جمع کیا گیا ہے کتاب ۲ جلدوں میں منقسم ہے اور ہر بحث "کلمۃ اللہ" یا صرف "کلمۃ" سے شروع ہوتا ہے اس کی ایک جلد کتاب خانۂ رامپور میں اور دوسری جلد خانقاہ مارہرہ میں ہے۔

شاہ صاحب کے اس کشکول میں شعرائے فارسی و اردو کے حالات بھی لکھے ہیں۔ کتاب کے ورق ۱۶ الف ب سے ۲۷ الف ب تک گیارہ ورق اردو کے شعرا کے حالات پر مشتمل ہیں۔ یہ کتاب ۱۱۹۷ھ میں لکھی گئی ہے (دیباچہ ص ۴۹ دستور الفصاحت مرتبہ عرشی)

دہلی میں کوکے خاں فغاں[1] جن کے ساتھ انہیں بڑا اخلاص و ارتباط تھا رہتے تھے لیکن آج کل پراگندہ حال اور بیکار ہیں[2] قاسم نے لکھا کہ وہ ہمیشہ عمدگی اور خوشحالی سے بسر اوقات کرتے تھے[3] بیل لکھتے ہیں کہ وہ دہلی میں سنہ ۱۱۷۴ھ مطابق سنہ ۱۷۶۰ء میں زندہ تھے[4]

بیاں عمر کے آخری حصے میں حیدرآباد میں نظام علی خاں[5] کی سرکار میں ملازم ہوئے[6] کریم الدین اس کی تاریخ سنہ ۱۷۹۳ء بتاتے ہیں[7] لیکن مصحفی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کریم الدین کی بتلائی ہوئی تاریخ سے بہت پہلے حیدرآباد چلے گئے تھے۔ وہ تذکرۂ ہندی (سنہ ۱۲۰۰-۱۲۰۶ھ) تالیف کرتے وقت بیاں کے ترجمے میں لکھتے ہیں:-

"مدتے گذشتہ کہ بہ طرف دکن رفتہ"[8]

مصحفی کے بیان کی مزید تائید قاسم کے بیاں کے ترجمے میں لکھتے ہیں:-

"چندے بہ حیدرآباد در سرکار ناظم آں بلاد ملازم بود۔ مدتے است کہ از احوال۔ خیر ماتش اطلاع نیست۔ بہرجا کہ باشد خدایش خوش دارد۔"[9]

۱۔ فغاں کے بارے میں عاشقی لکھتے ہیں:-

"فغاں اشرف علی خان شاہجہاں آبادی مشہور بہ "کوکہ" چہ مادر آں مرحوم احمد شاہ بن فردوس آرامگاہ حضرت محمد شاہ را شیر دادہ بود، لہذا بایں لقب شہرت داشت۔ در اوائل عہد احمد شاہ بادشاہ مرحوم، از دہلی متوجہ دیار مشرق شد۔ و اول بصوبہ اودھ رسیدہ، با نواب شجاع الدولہ بہادر پیوست و چندی در آں جا بسر ساخت و من بعد در سنہ ۱۱۷۰ھ یک ہزار و یکصد و ہفتاد عظیم آباد رفتہ براجہ شتاب رائے ناظم صوبہ بہار توسل جست و راجۂ قدردان بخوبترین وجہ بادی پیش آمدہ برفاقت خود کشید و متکفل معاش او گردید و بوساطت وے خطاب ظریف الملک از حضور شاہ عالم بادشاہ مغفور کہ در آں ہنگام در بلدۂ الہ آباد رونق پذیر بودند یافت۔ خان مذکور کمال شگفتہ مزاج بود و از بس ظرافت و مزاح بر خاطر داشت (نشتر عشق قلمی ص ۵۲۱)

فغاں مشہور مرثیہ گو مرزا ندیم کے شاگرد تھے۔ انہیں جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی غزل، قصیدہ، مرثیہ اور رباعی خوب کہتے تھے۔ صاحب دیوان تھے۔ ان کے کلیات میں تقریباً دو ہزار شعر ہیں (تذکرۂ شورش ص ۱۰) ان کا انتقال سنہ ۱۱۸۶ھ میں ہوا۔ عشقی نے تاریخ وفات یہ لکھی تھی "سر در دہا رفت" سنہ ۱۱۸۶ھ عظیم آباد میں بقرۂ آغا حسینا میں مدفون ہیں (تذکرۂ عشقی ص ۱۰۱)

۲؎ مخزن نکات صہ ۴۷ نوشتہ ۱۱۶۸ھ
۳؎ مجموعہ نغز جلد اول صہ ۱۲۳، ۴؎ ڈکشنری صہ ۹۸ بیل
۵؎ میر نظام علی خان آصف جاہ ثانی یکم شوال ۱۱۴۶ھ کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام حفیظ الدین خان ہے۔ دربار شاہان دہلی سے خان بہادر اسد جنگ کا خطاب حاصل کیا۔ ۴ ذی الحجہ ۱۱۷۵ھ کو اپنے بھائی صلابت جنگ کو معزول کر کے تخت نشین ہوئے۔ ۴۲ سال حکومت کر کے ستر برس چھ ماہ کی عمر میں ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء کو وفات پائی۔ مکہ مسجد میں مدفون ہیں (بیل صہ ۳۰۰)
۶؎ عمدۂ منتخبہ صہ ۱۲۵ ،۷؎ طبقات الشعرا صہ ۱۵۴ کریم الدین
۸؎ تذکرۂ ہندی صہ ۳۶ مصحفی
۹؎ مجموعہ نغز جلد اول صہ ۱۲۳ (نوشتہ ۱۲۰۶-۱۲۰۷ھ)

مولف خمخانۂ جاوید کا یہ کہنا بالکل بے بنیاد ہے کہ بیان ۱۸۰۰ء مطابق ۱۲۱۸ھ میں سرکار نواب نظام علی خاں نظام الملک والی حیدر آباد دکن کے ملازم تھے[1] بہر حال وہ حیدر آباد میں ۱۲۱۳ھ سے قبل ممتاز عہدے پر سرفراز تھے۔ یکتا لکھتے ہیں :-

"می گویند کہ تا حال زندہ است بطرف دکن در سرکار نظام علی خان عہدہ اعتباری دارد[2]"

بیان نے بڑی عمر پائی۔ ان کا انتقال حیدر آباد میں ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء میں ہوا۔ ان کے ایک شاگرد رائے گلاب چند ہمدم[3] نے تاریخ وفات لکھی۔ مادۂ تاریخ یہ ہے "استاد از جہاں رفت" جس سے ۱۲۱۳ ہجری نکلتے ہیں[4] مولف محبوب الزمن[5] اور قاموس المشاہیر[6] بیان کا سن وفات ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۳ء بتاتے ہیں جو غلط ہے۔ شیفتہ نے گلشن بے خار میں ان کی تاریخ وفات بالکل نہیں بتائی ہے نفیس اکیڈمی کراچی کے ادارہ پر انتہائی افسوس ہو رہا ہے کہ اس نے گلشن بیخار کے ترجمہ میں اپنی طرف سے بیان کا سال وفات ۱۸۹۸ء لکھ کر سخت غلطی کی ہے[7] ادارہ نے بہت سے مقامات پر اپنی طرف سے بعض شعرا کا سن ولادت اور تاریخ وفات ۱۸۹۸ء لکھی ہے جو غلط اور گمراہ کن ہے

بیان مسلک طریقت میں مولانا فخر الدین[9] کے مرید تھے۔ شعر و سخن میں مرزا مظہر

۱؎ خمخانۂ جاوید جلد اول صہ ۶۱۷، دستور الفصاحت صہ ۸۳
۲؎ ہمدم۔ رائے گلاب چند نام اور ہمدم[2] تخلص۔ نواب شمس الامرا کی سرکار میں پیش کار تھے احسن اللہ

خاں بیان دہلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۲۱۵ھ ہجری میں ان کا کلیات مرتب ہو چکا تھا جسکو ان کے فرزند چھوٹو لال زیب نے ۱۲۸۰ھ میں طبع کر کے شائع کیا ہے۔ کلیات میں مثنویاں، غزل، قصائد سب کچھ شامل ہیں۔ وہ بلند مرتبہ شاعر تھے (دکن میں اردو ص ۵۴۸)

۴ھ خمخانۂ جاوید ص ۶۱۷ جلد اول، گل رعنا ص ۱۹۲، جواہر سخن جلد اول ص ۲۹۳، دیباچہ دستور الفصاحت ص ۲۶ عرشی) یادگار ضیغم۔

۵ھ محبوب الزمن ص ۳۰۸ جلد اول، ۶ھ قاموس المشاہیر جلد اول ص ۱۴۵

۷ھ گلشن بیخار (ترجمہ اردو) ص ۴۵ نفیس اکیڈمی کراچی دسمبر ۱۹۶۳ء

۸ھ تاریخ ادب اردو ص ۸ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

۹ھ مولینا فخر الدین۔ ابن نظام الحق، اولیائے کرام سے تھے۔ شعر و سخن سے بھی ذوق تھا۔ سید الشعرا کے لقب سے مشہور ہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں نظام العقائد، رسالہ مرجع اور فخر الحسن یادگار ہیں۔ انہوں نے ۷۲ برس کی عمر میں ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں وفات پائی اور دہلی قدیم میں قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ کے قریب مدفون ہیں۔

ان کا مقبرہ سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے جس پر ان کا نام اور تاریخ وفات کندہ ہے۔ مولانا کا پوتا غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب بڑے علامہ اور متقی تھے۔ وہ بھی شاعر تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں ہوا۔

(بیوگرافیکل ڈکشنری ص ۱۲۷ بیل)

جان جاناں سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱ے بیان ان دونوں کا بے حد احترام کرتے تھے۔ مظہر کے بارے میں کہتے ہیں۔

بندے سے ثنا حضرت استاد کی کب ہو — مظہر ہے خداوند کی وہ شان اتم کا
کیا کیجیئے بیاں اس کے وجوب اور قدم کا — طاقت نہ زباں کی ہے نہ مقدور قلم کا

بیان اردو کے ممتاز شاعروں میں سے ہیں۔ وہ صاحب دیوان ہیں ان کا کلام ابھی تک نہیں چھپا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعرانہ عظمت سے لوگ آج تک ناواقف ہیں۔ شگفتگی بیان کے اعتبار سے ان کا مرتبہ شاعری میر اور درد سے کسی بھی صورت میں کم نہیں ہے۔ وہ ان کے ہم پلہ ہیں بلکہ بعض خصوصیات میں جہاں تک فن شاعری کا تعلق ہے ان سے دو قدم آگے ہیں ان کا رنگ سخن میر، درد اور یقین سے ملتا ہے۔ اکثر غزلیں چھوٹی

چھوٹی بحروں میں چار چار پانچ پانچ شعر کی ہیں۔ بیاںؔ، سوداؔ، میرؔ، دردؔ، سوزؔ، حاتمؔ، قائمؔ، حسنؔ وغیرہ جیسے ممتاز اُردو شعرا کے ہمعصر تھے اور کم وبیش تمام پرانے تذکروں ؎۱ میں ان کا نام امتیازی خصوصیت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ وہ اصول شاعری سے باخبر، خوش گو، تیز طبع اور مشاق سخنور تھے۔ کلام میں نمکینی اور رنگینی ایسے غضب کی ہے کہ شعر پڑھکر انسان پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور دل پہلو میں پھڑک اُٹھتا ہے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی زبان کی سلاست اور شگفتگی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ غیر مانوس الفاظ وتراکیب، بعید از فہم استعارات وتشبیہات اور پیچیدہ بندشوں سے اپنے کلام کو صاف وپاک رکھا ہے ان کا کلام حسن انتخاب کا ایک بہترین نمونہ ہے اس میں کسی قسم کا تصنّع اور تکلّف نہیں پایا جاتا ہے۔ محاورات کی بندش چست اور بے ساختہ ہے۔ جو کچھ کہا سیدھی سادی زبان میں کہا اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان کا ایک ایک شعر سادگی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

بیاںؔ اپنے زمانے میں ایک کہنہ مشق اور مسلم الثبوت شاعر تھے۔ مظہر جانجاناں کو ان کی شاگردی پر بڑا فخر تھا۔ اسپرنگر کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ بیاںؔ قائمؔ کے شاگرد تھے ؎۲ قائمؔ نے اپنے تذکرہ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہا ہے بلکہ یہ لکھا ہے "خاکپائے طلبائے جہاں اعنی قائمؔ ہیچداں سراپا نقصان تکرار سبق خود بیشتر بلکہ بلاناغہ مے فرمود" ؎۳

بیاںؔ بڑے ذہین اور ہونہار تھے۔ طبیعت ابتدا سے موزون تھی۔ ابتدا میں صرف کی کتابیں پڑھیں۔ بعد میں شعر گوئی کا ذوق غالب ہوا اور چند ہی روز میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ ان کا ریختہ کلام فصاحت و بلاغت کی کان ہے اور ایک ایک لفظ سے شیرینی ٹپکتی ہے۔ معاملہ بندی کے ساتھ ساتھ اخلاقی مضامین بھی عجب نفاست سے نظم کئے ہیں۔ بڑے بڑے اساتذۂ سخن نے ان کے کلام کو حسن خلوص وعقیدت سے سراہا۔

؎۱ تذکرۂ ریختہ گویاں ص ۲۷، شعرائے اُردو ص ۲۶ میر حسن، چمنستان شعرا ص ۵۲، گلشن ہند ص ۶۵

؎۲ اودھ کیٹلاگ ص ۲۱۲

؎۳ مجموعہ نغز جلد اول ص ۱۲۳

ان میں سے چند یہ ہیں۔

گردیزی۔ "بیاںؔ بحسن صورت وسیرت محلی است وبہ فہم وفراست محلی وطبعش معشی" ؎۱

شفیق ۔ "درمعنی طرازی مزاج والائش علم اندیشہ آسمان پیمائی داشت" ۲؎

حسن ۔ "عذب البیان از خوش گویان زماں ۔ کلامش چون تبسم گلرخان نمکین و بیانش چون قند دلبران شیریں ۔ بندہ از فکر او بسیار محظوظ است" ۳؎

شوق ۔ "شاعر مربوط و مضبوط و خوشگو است" ۴؎

مصحفی ۔ "شاعر مربوط گو و صاحب زبان است ۔ فقیر او را ہنوز نہ دیدہ ۔ حق تعالےٰ سلامت دارد" ۵؎

قائم ۔ "ہنگامہ آرائی صحبت اشعار است ۔ در فن ندیمی دستمایہ دارد" ۶؎

شورش ۔ "دادرس دردمنداں، طبعش معنی ایجاد، خوبصورت و سیرت و یکتا در فہم و کیاست"

لطف ۔ "بیاں عاشق مزاج اور شیریں زبان تھا ۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان تھا" ۸؎

عشقی ۔ "خوش فکر و فصیح بیان بود در شیوۂ شیریں بیانی و زباندانی داد فصاحت می دارد ۔ جمیع ریختہ گویان معاصر او را بہ غزل سرائی مسلم دارند و در رباعیات او را مطبوع پندارند" ۹؎

سرور ۔ "در ریختہ گوئی مشاق و خوش فکر است و مربوط و صحیح البیان" ۱۰؎

یکتا ۔ "بیاں ہفتم از طبقۂ ثانی، شاعر متین و مربوط کہ کلامش نہایت مقبول و مضبوط ۔ ہر شعرش گویا آئینہ ایست بآب و تاب و دیوانش از اول تا آخر ہمہ انتخاب ۔ اگر بہ تامل نگاہ کردہ آید بندش و تالیف او کم از ہیچ استادی نیست" ۱۱؎

جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا ہے بیاں صاحب دیوان ہیں ۔ اس کا ایک نسخہ مولف خمخانہ کی ملکیت میں تھا ۱۲؎ اب یہ شاید بنارس ہندو یونیورسٹی کی زینت ہے ۔

۱؎ تذکرہ ریختہ گویاں ص ۲۷

۲؎ چمنستان شعرا ص ۵۲

۳؎ شعرائے اردو ص ۲۶ حملہ طبقات الشعرا قلمی ص ۸۹ نوشتہ ۱۱۸۸ھ

۵؎ تذکرہ ہندی ص ۳۶

۶؎ مخزن نکات ص ۴۷، ۷؎ تذکرہ شورش ص ۸۳

۸؎ گلشن ہند ص ۶۵

۹؎ تذکرہ عشقی ص ۸۴

۱۰؎ عمدۂ منتخبہ ص ۱۴۴

۱۱ھ دستور الفصاحت صہ ۸۲

۱۲ھ خمخانۂ جاوید جلد اول صہ ۶۱۷

۱ھ مولوی عبدالحق کہتے ہیں کہ ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہے راقم نے انڈیا آفس کی فہرست دیکھی مگر دیوان بیاں کے بارے میں کہیں کچھ نہیں لکھا ہوا دیکھا۔ کتب خانہ سالار جنگ کے علاوہ دیوان بیاں کا ایک قلمی نسخہ جو ۱۲۰۰ھ میں بیاں کی حیات میں لکھا گیا تھا۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے۔ اس میں ردیف وار غزلیات، رباعیات، قصیدہ، ہجو، مثنوی غرضیکہ جملہ اصناف سخن موجود ہیں۔ آغاز اس شعر سے ہوتا ہے

کیا کیجیے بیاں اوس کے وجود اور قدم کا — طاقت نہ زباں کی نہ مقدور قلم کا

اختتام ۔ صدق دل سے جو کوئی ہو اس گھر کا غلام — وہ کسو در پہ کبھو لیکر نہ جاوے التجا

ترقیمہ تمت در ۱۲۰۰ھ

درج ذیل اشعار میں بیاں کا نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔ زبان کی گھلاوٹ اور دلاویزی اور الفاظ کی سادگی میں لذت کشش اور موسیقیت قابل توجہ ہے۔ شعر کیا کہے ہیں گویا موتی لڑی میں پرد‌ئے ہیں۔ ان میں تصوف کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔

میں ترے ڈر سے رو نہیں سکتا — گرد غم دل سے دھو نہیں سکتا
شب مرا شور گریہ سن کے کہا — "اس کے ہاتھوں میں سو نہیں سکتا"
مصلحت ترک عشق ہے ناصح — لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

جو مسلسل بیاں کہتا ہے
کوئی موتی پرو نہیں سکتا

گو کہ ناصح کو اعتبار نہیں — دل پہ میرا کچھ اختیار نہیں
وہ نگاہیں جگر میں پیر گئیں — کون وار ہے کہ پار نہیں
وقت آنے کا اپنے تو مت پوچھ — مجھ کو کس آن انتظار نہیں

جھانک ٹک باغ دل میں اپنے بیاں
اس چمن بھی کم بہار نہیں

بیت خود کام چلا جاتا ہے — صبر و آرام چلا جاتا ہے

عمل نیک سدا رہتا ہے — جم نہیں جام چلا جاتا ہے
ہے کدھر قیس کدھر ہے فرہاد — عشق سے نام چلا جاتا ہے

عشق میں صبر کی دولت سے بیاںؔ
بارے کچھ کام چلا جاتا ہے

اپنے نہ دامن میں گہر چاہیئے — اشک کے قطروں میں اثر چاہیئے
پائے طلب کھینچ کے بیٹھوں کہاں — خانہ نشینی کو بھی گھر چاہیئے
دام میں جو شخص کہ اپنے پھنسے — اس کی کبھو لینی خبر چاہیئے
دل تجھے جیسا کہ خدا نے دیا — مجھکو بھی ویسا ہی جگر چاہیئے

بس ہے بیاںؔ حسرت دیدار اور
کیا تجھے اب خاک بسر چاہیئے

جادو تھی کہ سحر تھی بلا تھی — ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی
کیدھر ہے کہاں خوش ادائی تو — ہم سے بھی کبھی تو آشنا تھی

مارا ہے بیاںؔ کو جس نے اے شوخ
کیا جانئے کون سی ادا تھی

تیغ چڑھ اس کی سان پر آئی — دیکھیں کس کس کی جان پر آئی
کیجئے عرض حال کو، کچھ ہو — نہیں رہتی زبان پر آئی

غیر کے آگے دل کی بات بیاںؔ
آہ میری زبان پر آئی

ہوئی آہ اب اس قدر نارسا — کہ سینے سے آتی نہیں لب تلک
نپٹ ہی بیاںؔ کا برا حال ہے — تغافل ارے بے خبر کب تلک
یہی دن ہے ملنا ہے تو اس سے مل کر — کہ جیتا نہیں آج کی شب تلک

جانے دے مجھکو اے ہوس سیر گلستاں — اب اس چمن سے اپنے غم آباد کی طرف
وامق تو کیا ہے قیس بھی جاتا ہے مجھکو بھول — جب دیکھتا ہوں حسرت فرہاد کی طرف
ہووے گا ذوق حسرت دیدار میں خلل — شیریں گذر نہ کیجو فرہاد کی طرف

باتوں میں آہ کس نے لگایا اسے بیاںؔ
رکھتے تھے کان ٹک مری فریاد کی طرف

جو ہوتا ہے ریحان و سنبل کے صدقے | نہ ہو کیونکہ اس زلف و کاکل کے صدقے
خزاں میں بھی چھوڑا نہ طوف چمن کو | غرض ہو جیے عشق بلبل کے صدقے
جلو میں پھرے ہیں پریزاد لڑکے | دوانے ترے اس تجمل کے صدقے
ابھی وعدہ کر کہ لگا سوچنے تو | نہیں یاد گویا تامل کے صدقے

بیاںؔ کون ہے اب تلک پوچھتے ہو
تغافل کے مت مربان تجاہل کے صدقے

رسوا ابھی سے کرتی اے چشم تر مجھے | آتا ہے اس کی بزم میں بار دگر مجھے
آیا ہوں اس گلی میں ابھی دم نہیں لیا | پھیرے چلا ہے یہ دل وحشی ادھر مجھے

کنج قفس سوا مری قسمت میں جا نہ تھی
تو کیوں دیئے فلک نے بیاںؔ بال و پر مجھے

جا کہے کوئے یار میں کوئی | مرگیا انتظار میں کوئی
وہ بھی کیا رات تھی کہ سوتا تھا | سر رکھے اس کنار میں کوئی

بیاںؔ نے رباعیات بھی کہی ہیں۔ اور بقول میر حسن یہ رباعیات دلپسند ہیں لہ غزل کی طرح رباعی کی زبان بھی بڑی شیریں اور شگفتہ ہے۔ رباعی لکھنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے فن اور الفاظ و بیان پر یکساں قدرت کی ضرورت ہے۔ بیاںؔ کی رباعیات میں یہ دونوں خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ سچ پوچھیے تو ان کی رباعیات ان کے ہمعصر شعرا جیسے سوداؔ، میرؔ، دردؔ، یقینؔ، میر حسنؔ، حسرتؔ، جرأتؔ، وغیرہ سے زبان، خیال اور بندش الفاظ کے اعتبار سے پختہ اور سنجیدہ ہیں۔ اس فن میں وہ اپنے ہمعصر شعرا سے یقیناً سبقت لے گئے ہیں۔ اور اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ وہ ایک کہنہ مشق، مسلم الثبوت اور قادر الکلام اُستاد تھے۔ راقم کو ان کی جتنی رباعیات دستیاب ہوئی ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں ان میں خصوصیت کے ساتھ ایک انداز دلکشی پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان رباعیات میں اخلاقی، عاشقانہ اور تصوف کے مضامین باندھے گئے ہیں۔ ظرافت کی چاشنی بھی قابل غور ہے:۔

(۱) جس وقت بیدار وہ ہوتا ہوگا | عالم کی غضب سے جان کھوتا ہوگا
غنچوں سے صبا کہیو کہ آہستہ کھلیں | زانو پہ مرے وہ شوخ سوتا ہوگا

(۲) اب تم سے کہوں جو کچھ ہے دل میں میرے | سب تم سے کہوں جو کچھ ہے دل میں میرے
پہلے کہہ تو کہ میں نہ مانوں گا برا | تب تم سے کہوں جو کچھ ہے دل میں میرے

(۳) مست کہیو بیاںؔ پیام اجل پیتا ہے | یا اس کے لئے کوئی کفن سیتا ہے
یارو مرے حال کو جو پوچھے وہ شوخ | اتنا کہیو کہ اب تلک جیتا ہے

(۴) کیا زلف میں اس شوخ کی ہے دکھی صبح | یا شام سے ہوتی ہے کسی شب کی صبح
ٹک زلف کو میں ہاتھ دکھایا کہ ادھر | ہمسایہ پکارا کہ ہوئی کب کی صبح[۳]

(۵) سو طرح سے یہ عشق لبھاتا ہے مجھے | ہر چیز میں آ جلوہ دکھاتا ہے مجھے
کس ماہ کا یہ عکس پڑا ہے یا رب | ہر چاہ میں یوسف نظر آتا ہے مجھے

---

۱ تذکرہ شعرائے اردو ص ۲۶

۲ تذکرہ عشقی ص ۸۶ پر اس رباعی کا قافیہ یوں ہے "....تم سے کہوں جو کچھ ہے دل میں میرے"

۳ یہ رباعی آسی نے غلطی سے کلیات سودا جلد اول ص ۴۵۲ میں سودا کی طرف منسوب کی ہے اور اس کو یوں لکھا ہے ؎

کیا زلف میں اس شوخ کے تھی دکھی صبح | جو شام سے ہوتی ہے کسی شب کی صبح

مرزا علی لطف نے گلشن ہند ص ۶۵ پر بیاںؔ کی اس رباعی کو یوں لکھا ہے ؎

کیا زلف میں اس شوخ کے تھی دکھی صبح | یا شام سے پھوٹی تھی کسی شب کی صبح

---

(۶) دنیا سے بیاںؔ چلا ہوں روتے روتے | گزری سب عمر اپنی روتے روتے
ظلمات میں تھا آب بقا پر افسوس | روشن یہ ہوا صبح کے ہوتے ہوتے

(۷) کہتا ہوں جناب حق میں ڈرتے ڈرتے | مدت گزری دعا ہی کرتے کرتے
ہے اس کو یہ قدرت کہ بیاںؔ سا محرم | منہ یار کا دیکھ لیوے مرتے مرتے

(۸) کیا تو نے سمجھ کے دل بیاںؔ اس کو دیا | میں کیا کہوں اس کی خوبیاں ہیں کیا کیا
بد خو، بد عہد، شوخ، سرکش، مغرور | بے دین، بے مہر، بے وفا، بے پروا

(۹) جس شخص سے ہوتی نہیں قنبر کی مدح | وہ کیوں کہ کرے حیدر صفدر کی مدح
مجھ سے تو لیقن کی نہیں ہوتی تعریف | کس منہ سے کروں حضرت خضر کی مدح

(۱۰) از بس میں نہیں زباں پہ اپنی قادر | اکثر ہوتی ہیں دل کی باتیں ظاہر
کہتا ہے وہ طفل شرمگیں جھنجھلا کر | یا رب عاشق نہ ہو کسی کا شاعر ع

بیاںؔ مرثیہ بھی کہتے تھے لیکن ان کے مرثیوں میں وہ سوز وگداز اور درد واثر نہیں پایا جاتا ہے۔ جوان کے معاصر مرثیہ گو شعراء کے کلام کا طرۂ امتیاز تھا۔ بیاںؔ کے ایک مرثیہ کا انتخاب درج ذیل ہے۔ [1]

پیغمبرؐ کی ہوئی جس وقت رخصت گئیں جنت میں جب خاتون جنت

علیؑ کی بھی ہوئی ثابت شہادت حسنؑ بھی ہو چکے دنیا سے رخصت

اکیلا پا کے آل مصطفےٰ کو

دیئے یہ دکھ حسینؑ مجتبیٰ کو

دغا کے خط لکھے اہل خطا نے وفا ظاہر کی قوم بے وفا نے

ابا مطلق نہ کی آل عبا نے کیا باور سب ابن مرتضیٰ نے

کہ ہیں نانا کے آخر اپنی امت

نہیں یہ عذر سے اقرار بیعت

دلاسا دی ہوئے رخصت وطن سے کہ جیسے گل جدا ہووے چمن سے

کیا یوسف کو عریاں پیرہن سے نکالا روح کو گویا کہ تن سے

غرض رخصت ہوا سالار دیں کا

مصمم قصد کر دس سرزمیں کا

چلے منزل بہ منزل کربلا کو کیا مختار کار اپنا رضا کو

خبر پہنچی ادہر اہل دغا کو لکھا وہاں شام میں اوس بے حیا کو

کہ سید کو کیا تزویر سے صید

کریں اب ذبح یا اس کو کریں قید

---

[1] اردو مرثیہ ص ۲۵۵ سید سفارش حسین

بیاںؔ نے مثنوی بھی تصنیف کی ہے۔ میر حسنؔ اس مثنوی کا نام "چنچ نامہ" بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "چنچ نامہ از و مشہور است، بسیار خوب گفتہ" [1]
قاسم اس کا نام "چنگ نامہ" لکھتے ہیں اپنے تذکرہ میں اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ "در مثنوی خود مسمی بہ چنگ نامہ دادہ شاعری دادہ" [2] اسپرنگر ذکا کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ بیاںؔ نے

ایک مثنوی لکھی جس کا نام "جنگ نامہ" ہے لیکن قاسم اسے "مثنوی چیپک نامہ" کہتے ہیں[۱] ممکن ہے کہ اسپرنگر کے پاس مجموعۂ نغز کا کوئی دوسرا نسخہ ہو جس میں قاسم نے بیان کی مثنوی کا نام "چیپک نامہ" لکھا ہو۔ ہم نے مجموعہ نغز میں "چنگ نامہ" ہی دیکھا ہے۔ علی ابراہیم خان خلیل تذکرہ گلزار ابراہیم کے حاشیے[۴] پر بیان کے ترجمے میں اس مثنوی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"چیپک نامہ" خواجہ احسن اللہ بیان کہ نام بسیار جانوران دران درج است مشہور است

کہ مطلعش ایں است ؎

میرزا فیضو کی چیپک مر گئی — حوش خانے جنگ کے ویران کر گئی

میرزا غمگین چھپیاں شاد ہوں — گھونسلے چڑیوں کے یوں آباد ہوں[۴]

بیان فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ فارسی میں انہوں نے کوئی دیوان تصنیف کیا تھا کہ نہیں۔ ان کی فارسی شاعری کے بارے میں قریب قریب سبھی تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ عاشقی نے ان کے صرف دو شعر نقل کئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں فارسی میں بھی کامل دسترس حاصل تھی یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اردو کی طرح اُن کے فارسی کلام میں زبان کی فصاحت، سادگی اور شگفتگی بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے درج ذیل اشعار میں حسین اور دلکش تشبیہات اور خیال کی ندرت داد سے بے نیاز ہے ؎

بخون آلودہ مژگانم چہ نسبت شاخ مرجان را
کہ دل خون کرد اشک سرخ من لال بدخشاں را

زضعف ناتوانی رفت دامانش ز دست من
پئے دفع خجالت چاک می سازم گریباں را

۱؎ تذکرۂ شعرائے اردو ص ۲۶

۲؎ مجموعہ نغز جلد اول ص ۱۲۳

۳؎ اودھ کیٹلاگ ص ۲۱۲

۴؎ گلزار ابراہیم قلمی ص ۲۰ الف مجولہ دستور الفصاحت ص ۸۵ مرتبہ عرشی رامپوری کلیات سودا جلد اول ص ۳۹۳ مرتبہ آسی میں مثنوی در ہجو چیچ میرزا فیضو ۱۴ شعر پر مشتمل ہے اس میں نواں اور بارہواں شعر یوں ہیں:-

میرزا فیضو کے بہ چیچ مر گئے — قوش خانے جگ کے ویران کر گئے

گھونسلے چڑیوں کے یوں آباد ہوں ‏‏ میرزا غمگین ہوں چڑیاں شاد ہوں

۵ نشترِ عشق (قلمی)، ص ۱۰۶ الف حسین قلی خان عاشقی عظیم آبادی ۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

درد کا شجر

ایک المیہ رُجحان

فیض احمد فیض کی شاعری میں اس عہد کا باطنی اضطراب ملتا ہے اور اسی اضطراب نے اس شاعری کے ذریعہ ایک المیہ کردار دیا ہے۔ یہ کردار اس عہد کے انتشار اور داخلی کشمکش کی علامت ہے۔ فیض کی شاعری میں یہ باطنی اضطراب اور یہ المیہ کردار شعری اور تخیلی فکر اور حسّی تصورات میں نمایاں ہوتا ہے۔ عمدہ شاعری جذبۂ غم کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ فیض کے کلام میں جذبۂ غم ایک گہرا اور شدید جذبہ ہے "نقشِ فریادی" "دستِ صبا" "زنداں نامہ" اور "دستِ تہِ سنگ" میں المیہ فضا ملتی ہے۔

یہ شاعری کشمکش اور تصادم کی پیداوار ہے۔ جس طرح المیہ ہیرو اذیت اور تصادم کا شکار ہوتا ہے، اسی طرح شاعر بھی اذیت اور کشمکش کا شکار رہے۔ پورے عہد کی اذیت، اس کی ذات کی اذیت بن گئی ہے۔ شاعر کی انفرادیت المیات میں ابھرتی ہے۔ انفرادیت ایک مرکز ہے جہاں اس عہد کے اضطراب اور انتشار کی ہر لہر پہنچتی ہے۔ فیض کی شاعری میں اس عہد اور اس زمانے کے فرد کے المیہ کا حسن ملتا ہے اور المیہ کا یہی حسن ان کی شاعری کی سب سے اہم قدر ہے۔ المیہ ہیرو کی پہچان یہ ہے کہ "حسرتِ تعمیر" اس کا سب سے بڑا درد بن جاتا ہے اور اسی درد کو لئے وہ جدو جہد کرتا، مصائب سے لڑتا ہے، بُتوں کو توڑتا ہے۔ ذہنی کشمکش کا شکار رہتا ہے۔ مستقبل کے بارے میں طرح طرح سے سوچتا ہے۔ اپنی انفرادیت پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتا ہے اور داخلی طور پر بار بار شکست کھانے پر بھی شکست قبول نہیں کرتا۔ اس کی آرزومندی اسے بار بار نئی زندگی دیتی ہے۔ وہ خود اپنا ہمدرد بن جاتا ہے۔ ٹکرانے میں اسے لذّت ملتی ہے، زخموں کی ٹیس اسے لذّت بخشتی ہے۔ حسرتِ تعمیر کے درد کے ساتھ وہ داخلی طور پر اپنے اوپر سب سے زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ یہی درد فیض کا بھی ہے، ان کی شاعری میں جو المیہ کردار ملتا ہے وہ اسی درد سے پہچانا جاتا ہے اس عہد میں اس درد کی لذّت سے کون آشنا نہیں ہے۔

فیض کے پورے المیہ عمل میں صرف سسکتی ہوئی زندگی ظاہر نہیں ہوئی ہے بلکہ آرزومندی اور لذت مندی نے بہت کچھ حاصل بھی کیا ہے۔ ایک المیہ ہیرو اذیت اور تکلیف، کشمکش اور تصادم، ذہنی انتشار اور الجھن میں بہت کچھ حاصل بھی کرتا ہے" پرومیتھس باؤنڈ" کی مثال سامنے ہے۔ فیض نے اپنی شاعری سے مستقبل کا ایک دلفریب" الیوژن "پیدا کیا ہے۔ رومانی فکر سے تقدیر کے خدوخال کو دیکھا ہے۔ رومانی اندازِ فکر نے تقدیر کے بُت کو اپنے طور پر توڑا ہے، یقیناً یہ شاعری بہت اہم ہے جس نے میکانکی زندگی کو ایک بھرپور علامتی جواب دیا ہے۔

فیض کے کلام میں المیہ کی تعریف بھی ملتی ہے اور وہ یہ کہ حال کے درد و غم کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے مستقبل کو حال میں محسوس بھی کیا جائے۔ اس سے تخیلی فکر اور رومانی اندازِ فکر کی ہمہ گیری کا گہرا احساس ہوتا ہے اس تخیلی فکر اور رومانی انداز نے انتشار، تحیر، الجھن اور سسپنس کو نہایت ہی فنکارانہ انداز میں کرنا چاہیے، اسی آرزومندی نے اندرونی ویرانی کے احساس کو جذبات اور احساسات سے ہم آہنگ کیا ہے کچھ اس طرح کہ خود اپنی اندرونی ویرانی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ انانیت کی شکست بھی متاثر کرتی ہے اور مستقبل کا" الیوژن" بھی متاثر کرتا ہے، اس طرح جمالیاتی شعور کو آسودگی ملتی ہے۔

فیض احمد فیض کو تمام اخلاقی قدروں کا گہرا احساس ہے لیکن ان کی شاعری کا المیہ کردار اپنے جمالیاتی معیار ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے جذبہ اور وجدان، داخلیت اور خود مرکزیت ہی کی اہمیت سب سے زیادہ ہے ان کے رومانی اور جمالیاتی رجحان کی پہچان ان ہی باتوں سے ہوتی ہے۔ فیض کی پوری شاعری میں اس عہد کے میکانکی اصولوں اور آدمی کی فطرت کی کشمکش نمایاں ہے۔ داخلی اور خارجی کشمکش میں شاعر کی انفرادیت کی پہچان ہوتی ہے اور اس تصادم میں وہ المیہ کردار بھی اُبھرتا ہے جس کے کچھ دلفریب خواب ہیں اور جو اپنے عہد کی اذیت کو اپنی ذات کی اذیت بنا کر ان خوابوں کی خوبصورت تعبیروں کو پاتا اور ان خوابوں کو حقیقتوں میں تبدیل کرنا چاہتا ہے یہ آرزومندی اتفاقی چیزیں ہیں، فنکار کا مزاج اور اس کا رجحان اور شاعری کی بہت سی پختہ، تابناک اور روشن روایات اس کے پیچھے ہیں۔ قدروں کی پہچان میں ان روایات نے بڑی مدد کی ہے۔ فیض نے قدروں کے تصادم کا گہرا احساس دلایا ہے، اس تصادم کا احساس دلاتے ہوئے وہ خود ذہنی اور جذباتی کشمکش کے شکار ہوئے ہیں، ان کی کمزوریاں ظاہر ہوئی ہیں۔ ہمیں ان کی کمزوریوں سے جذباتی ہمدردی ہو جاتی ہے۔

فیض کو اپنے اندازِ فکر اور اپنے رجحان پر وہی اعتماد ہے جو یونانی ڈراموں کے المیہ کرداروں کو داخلی طور پر خود اپنے اوپر تھا۔ حالات اور ذہن کے تصادم میں غم نوشی اور آرزومندی کے ساتھ فیض کی شاعری آگے بڑھتی ہے۔ پوری شاعری میں ایک متحرک قوت کا احساس ہوتا ہے اس ساشاعری کا المیہ کردار بظاہر

تنہا نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم سب ضمنی کرداروں کی طرح اس کردار سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

فیض کا جذباتی رجحان بہت شدّت سے متاثر کرتا ہے اس لئے کہ اسی رجحان سے جذبات اور خارجی قدروں کی کشمکش کا احساس ہوتا ہے اور اس تضاد پر نظر جاتی ہے جس سے المیہ جنم لیتا ہے۔ شاعر کے جمالیاتی شعور اور پختہ رومانی فکر سے جمالیاتی مسرت اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ المیہ سے جب تک جمالیاتی آسودگی نہ ملے اس وقت تک المیہ کی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس شاعری کا کردار اخلاقیات سے نہیں اُبھرتا، وہ کچھ اخلاقی اصول اور عقائد لے کر نہیں آتا، وہ جذبات کا پیکر ہے۔ وہ اپنی حیاتی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کا داخلی عمل اور ردِ عمل قابلِ توجہ ہے۔

فیض کی شاعری میں جذباتی زندگی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی بہت سی تہیں ہیں۔ مخصوص سیاسی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے جب کوئی کاروباری نقاد فیض کے کلام کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ سیاسی اور اخلاقی نکات تلاش کرتا ہے اور جب اسے مخصوص سیاسی اور اخلاق نکات نہیں ملتے۔ تو وہ اور فکر میں جمود کی باتیں کرتا ہے۔ فیض بھی ایسی تنقید سے متاثر ہوئے ہیں اور انہوں نے "نکات" کی پیشکش میں داخلی اور باطنی کیفیتوں کو پس پردہ ڈال دیا ہے ایسے موقعوں پر ان کی شاعری سطحی اور سپاٹ تجربوں کو پیش کرنے لگی ہے۔ اور وہ "المیہ کردار" روپوش ہو گیا ہے۔ جو اپنے تہہ دار اور الجھے ہوئے ڈرامائی عمل سے پہچانا جاتا ہے۔ تخلیقی اور تخیلی فکر اور شعری تجربہ، میکانکی اور ٹھوس خارجی تجربوں سے مختلف ہوتا ہے۔ آرٹ میں علامتی فکر ہوتی ہے المیہ (TRAGEDY) میکانکی فکر سے زیادہ ایک آرٹ ہے۔

فیض اپنے المیہ کردار کو اچھی پہچانتے ہیں لیکن اس کے باوجود شاعری کے "بین الاقوامی معیار" کی طرف لپکتے ہیں، جب تک یہ المیہ کردار ان کی شاعری میں ہے، اپنی "بین الاقوامی دلچسپی" کے باوجود وہ اس "معیار" تک نہیں جا سکتے اور اسی میں ان کی سلامتی ہے۔ 'نقالی' کا تصور تخلیقی شعور سے وابستہ ہے شاعری تاریخ کے مقابلے میں اگر زیادہ گہرا اور بلیغ عمل ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ ترقی پسند ادب میں ادب فوٹو گرافی کا آرٹ بن گیا ہے۔ عکاسی، اور نقالی کی اصلاحوں سے یہ سمجھا گیا کہ زندگی جیسی ہے اسی طرح پیش ہو۔ بڑے فنکاروں کی ادبی تخلیقات کو بھی اسی طرح دیکھا گیا۔ حقیقت نگاری، کی اصطلاح بُری طرح مسخ ہو گئی۔ شاعری جب تک خود ایک داخلی عمل نہ بن جائے اس کی اہمیت نہیں ہوتی۔ فکر و احساس کا داخلی عمل نہ بن جائے۔ اس کی اہمیت نہیں ہوتی۔ فکر و احساس کا داخلی عمل ہی سب کچھ ہے۔ شاعری کا کردار جتنا بھی فلسفیانہ ہو، وہ فلسفہ نہیں بنتی، ادب فکر کی ترجمانی کرتا ہے، جذباتی تجربوں میں تخلیقی جذبہ موجود ہوتا ہے ادبی قدروں کو داخلی اور باطنی قدروں سے تعبیر کرنا چاہیے، وہ داخلی قدریں جو شخصیت کو استوار کرتی ہیں اور حقائق زندگی اور شخصیت

کو پُر معانی بناتی ہیں۔ ادب کا کردار اپنی رومانی اور طلسمی دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ جمالیاتی تجربوں کے التباس اور الیوژن میں خارجی تجربوں اور قدروں کی پہچان ہوتی ہے۔ لیکن یہ پہچان ہی سب کچھ نہیں ہے، ادبی اور جمالیاتی تجربہ کی اپنی انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے حقائق پُر معانی بنتے ہیں۔ زندگی کے زہر قند، اور شکست و ریخت، دکھ اور درد اور المیات میں جو اندرونی حسن ہے وہ آرٹ کے ذریعہ اُجاگر ہوتا ہے اور ہم حسی پہلو کی ان سمتوں کو بھی دیکھ لیتے ہیں جنہیں آسانی سے محسوس بھی نہیں کرتے۔ جمالیاتی ادراک ہی سے حقیقت پسندی میں اندرونی زندگی زندگی کے نقوش پیدا ہوتے ہیں اور تخیل فکر اور وجدان اور جذباتی بصیرت میں حقیقت شامل ہوتی ہے۔ خارجی ذکات جتنے بھی حکیمانہ ہوں۔ وہ آرٹ کے طلسم میں جذباتی اور ذہنی نظام کے جزو بن جاتے ہیں۔

"دستِ صبا" کی ابتدائیہ میں فن و ادب سے متعلق فیض کا نقطۂ نظر بہت ہی سطحی اور گمراہ کن ہے اس کے علاوہ "دست تہ سنگ" میں ان کی جو تقریر شامل ہے اس میں بھی ترقی پسند تنقید کا عام فارمولا ہے۔

●

فیض کی رومانیت نے انفرادی جذبۂ عشق اور معاشرہ کو ایک دوسرے میں جذب کر دیا ہے۔ اس طرح ان کے یہاں المیہ کا جو تصور رہے۔ وہ انفرادی غم اور معاشرے کے غم دونوں کو ایک ساتھ نمایاں کرتا ہے۔ ماضی اور مستقبل سے دلچسپی لیتے ہوئے فیض نے اپنے احساس محرومی کو اچھی طرح پیش کیا ہے۔ اور اس طرح پورے معاشرے کی الجھنیں ظاہر ہو جاتی ہیں، پورے تمدن کا انتشار سامنے آجاتا ہے "مستقبل" پر بھروسہ ہے اور اسی سے اُمید جنم لیتی ہے۔ اس احساس کو صرف ایک "خواہش" ایک "امید" ایک "تمنا" اور ایک "آرزو" کا نام دینا چاہیے۔ خوبصورت "مستقبل" کا خواب ایک رومانی شاعر کا سب سے اہم اور تابناک خواب ہے۔ اور اسی خواب کے سہارے وہ زندہ رہتا ہے۔ یہ خواب نہ ہوتا تو شاعر بہت حد تک "ماضی پرست" بن جاتا۔ فیض کی شاعری کے المیہ کردار کو سمجھنے کے لئے ماضی اور مستقبل کے تصورات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ حال نے محرومی کا جو احساس دیا ہے اسی احساس نے اسے ماضی سے گہری دلچسپی لینے پر مجبور بھی کیا ہے اور مستقبل کا ایک روشن اور تابناک بھی بتایا ہے۔

المیہ کا یہ تصور ایک طرف پورے معاشرے کی ویرانی، الجھنیں، اور بحران کو ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف زندگی کی حرارت اور قوت اور آدمی کی تلاش و جستجو کی ایک واضح تصویر بھی پیش کرتا ہے۔ جد و جہد تصادم اور کشمکش اور زوال (FALL) اور شکست کے ساتھ آرزومندی اور حزنیہ اور طربیہ احساسات کی ملی جلی کیفیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ احساسات اہمیت رکھتے ہیں اس لئے کہ تاریک رات میں "صبح" کا انتظار

اور تابناک اور روشن 'کل' کا حیاتی تصور بھی ان ہی سے جنم لیتا ہے:-
فیض کی نظم "ملاقات" ان تمام حقائق کو پیش کرتی ہے جن کا ذکر کیا گیا ہے:-

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
ہزاروں مہتاب اس کے سائے
میں اپنا سب نور کھو گئے ہیں
یہ رات اسی درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے!
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتّے
گرے ہیں اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے ہیرے پرو گئے ہیں

(۲)

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے
ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے
الم نصیبوں جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں یہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقین جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

•

ملاقات کا درد اور اس کی لذت کا اندازہ کیجیے۔ فیض کا المیہ مزاج اور ان کا جذباتی اور
رومانی رجحان اچھی طرح ظاہر ہوا ہے۔ شعوری مشاہدہ بھی ہے۔ اور فکری قوت بھی۔ حزنیہ اور طربیہ

احساسات کی ملی جلی کیفیت قابلِ غور ہے۔ 'کل' کا حسیاتی تصور روحانی فکر کی تخلیق ہے۔ تخیل اور جذبہ کی آمیزش بھی ہے اور جبلی ردِعمل کے نقوش بھی ہیں۔ فنی اور تکنیکی اعتبار سے بھی یہ ایک کامیاب اور مکمل نظم ہے۔ اس نظم کا آہنگ شاعر کی شخصیت اور اس کے مزاج کی کیفیتوں کو سمجھاتا ہے۔ ایک المیہ کردار اپنے دہکتے ہوئے جذبوں کو چھپائے کھڑا ہے۔ اپنے درد کی لذّت سے آشنا ہے۔ اس نظم میں اس عہد کی ٹریجڈی کے خوبصورت تاثرات ملتے ہیں۔ آدمی کی خواہش اور تمنّا اور اس کی آرزومندی اور اس کے "الیوژن" کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اس نظم کے تاثرات کے پیچھے جانے کتنے خارجی تصورات اور جانے کتنی خارجی قدروں کی کشمکش موجود ہے۔ فیض کے المیہ وجدان کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نظم کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اندرونی جاگرتی نے اس المیہ وجدان کو پیدا کیا ہے، شدتِ غم بھی ہے اور آرزومندی بھی ہے۔ احساس اور جذبے کے اظہار کے لئے جمالیاتی شعور نے حسی تصور اور پیکروں کی تخلیق کی ہے ——— "درد کا شجر" "لمحوں کے زرد پتے" اور "خاموشی" کے قطرے۔ ان سے داخلی المیہ کیفیتوں کو سمجھا جاسکتا ہے۔ فیض نے اس نظم میں "رات" "شاخ" "ستارے" "کارواں" "مہتاب" "شجر" "پتے" "گیسو" "شبنم" "جبیں" "گلستاں" "شرر" "کماں" "جگر" "تیر" "نیشتر" "افق" "سحر" "شفق" "گلزار" اور اس قسم کے دوسرے عام الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن یہ الفاظ علامتوں کی صورت میں ہیں۔ عصری ہیجانات اور ذہنی اور جذباتی کشمکش سے جو تصورات پیدا ہوئے تھے، وہ داخلی بن گئے ہیں۔ یہ تمام خارجی الفاظ حسی کیفیتوں کو سمجھاتے ہیں۔ ہر علامت داخلی کیفیت کی ترجمان ہے۔ فیض نے رات کا ایک حسیاتی تصور "شجر" کے روپ میں پیش کیا ہے۔ صرف دو مصرعوں میں عہد اور معاشرے کی المناک قدروں اور غم اور درد کے بے پناہ پھیلے ہوئے سمندر کو سامنے رکھ دیا ہے:-

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

رات زندگی کے درد اور غم کی علامت بھی ہے۔ شاعر نے اس رات کو درد اور غم کا شجر کہا ہے اور شجر کی مناسبت سے دوسرے لفظوں کا استعمال کیا ہے اور انہیں علامتی رنگ دے دیا ہے۔ "رات" اور "شجر" دونوں داخلی کیفیتوں کے خوبصورت کنائے ہیں۔ رات کے ساتھ گذرتے ہوئے وقت کا تصور وابستہ ہے۔ آنے والے لمحوں کا احساس وابستہ ہے۔ "شجر" جتنا بھی جامد ہو اس کا حسیاتی تصور جامد نہیں ہے اس لئے کہ یہ خود "رات" کا پیکر ہے۔ شاعر کے جذبے کی طرح حسی تصور میں بھی شدت اور تیزی ہوتی ہے۔

اسی طرح "رات" اور "شجر" دونوں کے حسیاتی تصورات مسلسل حرکت کی کیفیتوں کو پیش کرتے ہیں۔ رات کو درد کا شجر کہہ کر رات کو معاشرے اور تہذیب کا مکمل اشارہ بنا دیا ہے ۔۔۔ صدیوں میں رینگتا ہوا معاشرہ اور صدیوں میں لہو اگلتی ہوئی تہذیب! اس طرح اس نظم میں "رات" اور اس کے ساتھ "درد کا شجر" دونوں آرچ ٹائپ ( ) بن جاتے ہیں۔ شاعر نے رات کے لفظ سے تاریکی اور گہری تاریکی اور اس تاریکی کے اسرار کے تاثرات اُبھارے ہیں۔ درد کا شجر بنا کر ایک مرکز کا احساس پیدا کیا ہے۔ یہ شجر (رات) عظیم تر ہے اس لئے کہ اس کی شاخوں پر لاکھ مشعل بکف ستاروں کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں۔ یہ رات انہیں نگل گئی ہے۔ ہزاروں مہتاب اس شجر کے سائے میں اپنا سب نور کھو کر گئے ہیں۔ اس رات کی کہانی طویل ہے۔ یہ رنگ، نغمہ اور روشنی کی بھی کہانی ہے۔ یہ آدمی کی داستان بھی ہے۔ یہاں فیض کی شاعری کا المیہ کردار اپنے مخصوص تصورات اور ہیجانات کے ساتھ اُبھرتا ہے درد اور غم کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے دوسرے پہلوؤں کو بھی دیکھتا ہے۔ داخلیت پسندی ایسی ہے کہ 'محبوب' کے تصور میں بڑی ہمہ گیری آگئی ہے۔ رنگ، نغمہ اور روشنی محبوب ہے، زمانہ محبوب ہے۔ اس رات پر پڑتی ہوئی تیز روشنی اور تیز شعاعیں محبوب کے پیکروں میں آتی ہیں۔

مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے
گرے ہیں اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں

اور پھر یہ کہتا ہے :-

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم، جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے!

المیہ ہیرو کا غم ہی اسکی دولت ہے۔ وہ اپنے غم اور اپنے جذبات کی آنچ سے راستے ٹٹولتا ہے۔ سوزِ غم ہی اس کا ساتھی ہے۔ اس غم کو وہ اسی رات کی دین سمجھتا ہے۔ اس درد کے شجر کا ثمر تصور کرتا ہے۔ آہوں کی آنچ سے جب یہ غم اور تپ جائے تو یہی غم شرر بن جاتا ہے۔ المیہ کردار کے رجائی رجحان کی اہمیت

کا احساس اسی مقام پر ہوتا ہے۔ اسی غم سے وہ اس درد کے جنگل کو پہچانتا ہے اور اسے یقین ہے کہ یہ غم سے وہ اس درد کے جنگل کو پہچانتا ہے اور اسے یقین ہے کہ یہ غم اپنی آہوں میں کچھ اور تپ جائے تو پھر بھی شہر بن جائے گا۔ درد کا یہ بھیانک جنگل جل جائے گا۔ رات پگھل جائے گی ـــــ اس کردار کی بے چینی اور اس کی مضطرب شخصیت سامنے آگئی ہے۔ اس المیہ کردار کے زخموں کی ٹیس اور اس ٹیس کی لذت اور اس کی اضطراری کیفیتوں کو دیکھیے :-

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے!

اس عہد کے اضطراب کی یہ علامت فیض کی شاعری کا عطیہ ہے۔ اضطراب کا یہ پیکر اپنے عقاید اور اپنی ذات پر سب سے زیادہ بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے وہ اس رات کے دیئے ہوئے غم کو سحر کا یقین سمجھتا ہے۔ اور اس یقین کو غم سے کریم تر تصور کرتا ہے۔ اور یہ سوچتا ہے کہ سحر شب سے عظیم تر ہے اسے 'صبح' کا انتظار ہے۔ لمحوں اور گزرتے ہوئے لمحوں کو دیکھکر اسے یقین ہے کہ جس صبح کا وہ منتظر ہے وہ صبح ضرور آئے گی۔ الم نصیبوں اور جگر فگاروں کی صبح افلاک پر نہیں ہے بلکہ سحر کا روشن اُفق وہیں ہے جہاں غم ملا ہے، درد ملا ہے، رات کی ملی ہے۔ تاریکیاں ملی ہیں اور جہاں تاریکیوں میں اپنی آہوں کی آنچ سے غم کی شدت بڑھائی گئی ہے ہر وہ پتہ چمک اُٹھے گا، روشن ہو جائے گا جس پہ لہو گرا ہے۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

جدید اردو نظم اور اولین مغربی اثرات

اردو میں نئی نظم کی روایت اور تصور کی ابتدا مغربی شعر و ادب کے نمونوں سے اردو شاعروں کے روشناس ہونے کے بعد ہوئی۔ یہ زمانہ کم و بیش انیسویں صدی کے آغاز کا ہے۔ جبکہ فورٹ ولیم کالج کا قیام (۱۸۰۰ء) عمل میں آیا اور جان گلکرائسٹ کی رہنمائی میں (۱۸۰۰ء ، ۱۸۰۴ء) تصنیف و تالیف اور ترجمے کا دور باقاعدگی سے شروع ہوا۔ بعد میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد، جب ہندوستان پر برطانوی اقتدار مکمل طور پر قایم ہوا تو انگریزی تعلیم و تفہیم کے رایج ہونے پر اردو شاعروں کو مغربی شاعری اور ادب کے وافر نمونوں سے اصل اور ترجمہ کی صورت میں واقفیت بڑھانے کے مواقع ملے اور نئی نظم کا مفہوم واضح طور پر متعین ہونے لگا۔

بہرحال، یہ مسلّمہ امر ہے کہ مغربی قوتوں نے نہ صرف ہندوستانی زندگی بلکہ شعر و ادب کو بھی گہرے طور پر متاثر کیا۔ اس سلسلہ میں تاریخی نقطۂ نظر سے اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ کہ انیسویں صدی سے پہلے یورپی قوموں نے اہل ہند کے ساتھ تمدنی اور تجارتی تعلقات قایم کئے تھے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مسیح کی ولادت سے قبل کے زمانے سے ہی بحری راستوں کے ذریعے۔ بیرو البطا قایم ہو چکے تھے۔ بی ساین لیونا لکھتے ہیں:

> ان تجارتی راستوں کی موجودگی سے مسیحی سنہ سے قبل ہندوستان اور مغرب کے درمیان بڑے پیمانے پر تجارت کا سلسلہ جاری تھا۔ اور وقتاً فوقتاً ہندوستان سے صنعت و حرفت کی چیزیں مغربی دنیا تک پہنچ جاتی تھیں ۔[1]

لیکن بعد میں یہ تجارتی تعلقات قایم نہیں رہے۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ اسلامی اقتدار کے عروج کے ساتھ اور مسلمانوں کے مصر فتح کرنے کے بعد یورپ والوں کے لئے بحری راستہ مسدود ہو گیا۔ اسلئے پندرھویں صدی کے اختتام تک وہ ہندوستان کا رخ نہ کر سکے مغلیہ بادشاہوں نے بدیسی حملہ آوروں اور دراندازوں کی روک تھام کے لئے بری راستوں پر حفاظتی تدابیر تو کیں، لیکن بحری راستوں کی نگرانی کے لئے کوئی انتظام نہ کیا۔ یہ راستے کھلے رہتے اور ان راستوں سے یورپی ممالک کی تجارتی کمپنیاں بلا روک ٹوک وارد ہوتی رہیں۔ اور آہستہ آہستہ اپنے اقتدار کی توسیع کر کے ہندوستان پر قابض ہو گئیں۔

[1] ایولیوشن آف انڈین کلچر صٓ ۲۴۶

اس سلسلے میں ۲۷ مئی ۱۴۹۸ء کا دن تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ جب یورپ کے ایک ملک پرتگال کا ایک سیاح واسکوڈی گاما ایک لمبے بحری سفر کے بعد ہندوستان کا ایک نیا بحری راستہ دریافت کرنے میں کامیاب ہوا اور کالی کٹ کے ساحل پر پہنچا۔ اس کے بعد پرتگیزیوں نے سلطان مصر کی بحری طاقت کو تباہ کرکے ہندوستان سے براہ راست تجارتی تعلق قایم کیا۔ لیکن عادل شاہی حکومت کی کمزوری نے ان کے لئے آہستہ آہستہ سیاست میں بھی دخل دینے کے مواقع فراہم کردیے۔ اور وہ اپنا اقتدار بڑھانے لگے ۱۵۱۰ء میں انہوں نے گوا پر تسلط جمالیا ۱۵۱۵ء تک دیو دمن اور چند دوسری مشہور بندرگاہوں کو بھی انہوں نے اپنے قبضے میں کرلیا۔ لیکن اٹھارویں صدی میں ان کی تجارت کو زوال آنے لگا۔ سیاسی طور پر وہ پہلے ہی کمزور ہو چکے تھے۔

۱۶۰۰ء میں انگریزوں نے ملکہ الزبتھ سے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کا پروانہ حاصل کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قایم کیا۔ ۱۶۱۲ء میں جہانگیر نے انگریزوں کو ایک شاہی فرمان کے ذریعے اجازت دے دی کہ وہ سورت میں تجارتی کوٹھی قایم کرلیں ۱۶۱۵ء میں سر ٹامس رو بادشاہ انگلستان کی طرف سے مغل دربار کا سفیر بن کر آیا اور اس نے کمپنی کے لئے چند مراعات حاصل کیں۔ جن میں ہندوستان میں تجارتی کوٹھیاں تعمیر کرنے کا اجازت نامہ بھی تھا ۱۶۱۹ء میں انگریزوں نے سورت کے علاوہ آگرہ، احمد آباد اور بھروچ وغیرہ میں اپنی کوٹھیاں قایم کی تھیں۔ اس کے بعد ۱۶۴۰ء میں انہوں نے مدراس سینٹ جارج تعمیر کیا۔ اور ۱۶۶۸ء میں چارلس دوم کی طرف سے بمبئی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تحویل میں دیا گیا۔ چارلس دوم کو بمبئی ۱۶۶۲ء میں پرتگالیوں کی طرف سے جہیز میں دی گئی تھی۔ چند ہی برسوں میں بمبئی انگریزوں کی ایک ترقی یافتہ نوآبادی بن گئی۔ اس کے بعد مشرقی ساحل پر بالاسور اور ہگلی میں انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں قایم ہوئیں۔ اور اس کے فوراً بعد پٹنہ، قاسم بازار اور وزیگاپٹم میں بھی کوٹھیاں بنائی گئیں۔

ادھر ہالینڈ کی ڈچ قوم نے بھی ہندوستان سے تجارتی تعلقات قایم کئے تھے۔ اور انہوں نے پرتگالیوں کو ان کے اقتدار سے دھکیل کر بنگال، بہار، اڑیسہ، سورت، پٹنہ اور کوچین میں تجارتی کوٹھیاں قایم کرلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے ساتھ ہندوستان کے مسالوں کی تجارت ان کے ہاتھ میں آگئی۔

انگریزوں کے اتباع میں فرانسیسی سیاست داں کولبرٹ نے بھی ۱۶۶۴ء میں فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی قایم کی اور ہندوستان کے ساتھ تجارتی تعلقات قایم کئے۔

ان یورپی ممالک کی حرص نے ان کے آپس میں مسابقت کے جذبے کو ترقی دی جس کا نتیجہ باہمی تصادم تھا۔ ہر ملک کی خواہش تھی کہ وہ تنہا ہندوستان کی دولت سے متمتع ہو۔ اس طرح ان کی آپس میں چپقلش بڑھتی گئی ادھر یورپ میں فرانس اور انگلینڈ کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ہندوستان کے ساحلوں پر وہ آپس میں لڑنے لگے۔ لڑائی کا

دایرہ وسیع ہو گیا اور پرتگال، ہالینڈ، فرانس اور انگلستان میں باہمی جنگیں چھڑ گئیں ان جنگوں کا اختتام انگریزوں کی مکمل ختم پر ہوا۔ اور ہندوستان میں بھی ان کے اقتدار کا سکہ جم گیا۔

اورنگ زیب کی حکومت کے آخری دور میں مغلیہ سلطنت کمزور ہو چکی تھی اور مختلف حصوں میں بغاوتیں شروع ہو چکی تھیں۔ انگریزوں نے یورپی حریفوں سے میدان کو صاف کر کے اندرونی انتشار اور کمزوری سے فایدہ اٹھانا چاہا اور مغلوں کے خلاف جارحانہ کاروائی شروع کی لیکن انہوں نے ابھی مغلیہ طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اورنگ زیب کے حکم سے بنگال کے صوبیدار شایستہ خان نے انگریزوں کو شکست دے کر ان سے کئی کوٹھیاں چھین لیں۔ بمبی کا بھی محاصرہ کر دیا آخر کار ایسٹ انڈیا کمپنی کو مغلیہ تاجدار کے سامنے جھکنا پڑا اور معافی مانگنے پر تجارت کے لئے نیا فرمان انہیں عطا ہوا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور آخری مغلیہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر تک ملک کی اندرونی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ اور انتشار، تباہی اور بدامنی کا دور تھا۔ ہر طرف شورشوں اور بغاوتوں نے سر اٹھایا تھا۔ اور مرکزی تنظیم پارہ پارہ ہو گئی تھی۔ راجپوت جو اگلے ادوار میں مغل سلطنت کے وفادار ستون تھے اب اس کے دشمن بن گئے تھے۔ سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں نے بھی ملک کے نظام کو تہہ و بالا کرنا شروع کیا تھا۔ محمد شاہ کے زمانے میں ملک کی یہ ابتری انتہا کو پہنچ گئی۔ اس زمانے میں نادر شاہ کا حملہ قہر الٰہی سے کم نہ تھا۔ اس نے قتل عام کا حکم دیکر تین ہزار بے گناہوں کو تلوار کے گھاٹ اتروایا۔ اور شاہی خزانہ خالی کر کے سارا روپیہ اپنے ساتھ لے لیا ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی شاہ افغانستان نے دہلی پر حملہ کر کے مرہٹوں کو پسپا کر دیا لیکن اس کے پیچھے بھی تباہی آگئی۔ اس کے نتیجے میں ملک کے مختلف حصوں میں خود مختار حکومتیں قایم ہوئیں۔ جو آپس میں برسر پیکار رہنے لگیں۔ مغلیہ اقتدار کے باقیات اوارنوں کے علاوہ سکھوں، راجپوتوں اور مرہٹوں نے خود مختار حکومتیں قایم کر کے بغاوت، لوٹ مار اور خانہ جنگی کی مہمیں تیز کر دیں۔

انگریزوں نے جن کا اقتدار اب سیاسی فضا پر نمایاں ہونے لگا تھا اس صورت حال سے فایدہ اٹھایا اور لارڈ کلائیو کی رہنمائی میں خستہ مغلیہ فوجوں کو مختلف مقامات پر شکست فاش دیکر بعض حصوں پر اپنا تسلط جما لیا۔ شاہان مغلیہ اب برائے نام حکومت کرتے تھے اور اصل میں حکومت کا سارا نظم و نسق انگریزوں کے ہاتھوں میں آگیا تھا۔ ان حالات میں حکومت انگلستان نے ۱۷۷۳ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ منظور کیا جو کہ ہند میں برطانوی نظام اقتدار کے آغاز کے لئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ وران ہیسٹنگز کو بنگال کا پہلا گورنر جنرل بنایا گیا۔ جن کے ماتحت تین پریزیڈنسیاں بنگال، مدراس اور بمبئی قایم ہوئیں۔ جہاں مکمل طور پر برطانوی راج قایم ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ کا ہنگامہ برپا ہوا جس کی ناکامی نے بہادر شاہ

ظفر کو معزول کیا اور مغلیہ سلطنت کا چراغ ہمیشہ کیلئے گُل کر دیا۔ باغی قوتیں بھی زیر ہو گئیں اور یکم نومبر ۱۸۵۷ء کو گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے الہ آباد میں ملکہ وکٹوریہ کا شاہی اعلان پڑھا جس کی رو سے ہندوستان پر باقاعدہ برطانوی حکومت قایم ہوئی۔

۱۸۵۷ء کے غدر کی تاریخی، سیاسی، سماجی اور نفسیاتی اہمیت کا ذکر کرنے سے پہلے اس امر کی طرف بھی اشارہ کرنا بھی مفید ہوگا کہ پندرھویں صدی سے ہند کے یورپی ملکوں سے تجارتی تعلقات قایم ہونے کے ساتھ ساتھ سیاحتی روابط بھی قایم ہو چکے تھے۔ چنانچہ یورپ کے مختلف ملکوں سے مختلف ادوار میں سیاح وارد ہند ہوتے رہے ان میں فریر، مان ریلی۔ برنیر۔ ٹے ورنیر، ہاکنس، سٹراسس رو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان سیاحتی تعلقات سے نہ صرف اہل ہند کے طرز فکر پر یورپی اثر پڑا بلکہ اہل ہند کی تہذیب و فکر اور ادب کے اثرات ان سیاحوں کے سفر ناموں کے ذریعے یورپی لوگوں پر بھی پڑے۔ مثال کے طور پر مشہور فرانسیسی سیاح برنیر ۱۶۷۱ء میں مغل شاہزادہ دارا شکوہ کا اپنشروں کا مسودہ فارسی ترجمہ کی صورت میں) اپنے ساتھ یورپ لے لیا۔ اور وہاں اسے متعارف کیا۔

۱۸۵۷ء کا غدر ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ اس نے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور نفسیاتی زندگی میں ایک زبردست انقلاب کا آغاز کیا۔ اور ہندوستان عہد وسطیٰ کے دھندلکوں سے نکل کر بیداری اور روشنی کے جدید دور میں داخل ہوا۔ سید احتشام حسین اپنے مقالے "اردو ادب انقلاب ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں" میں لکھتے ہیں:

۱۸۵۷ء کا انقلاب ایک خاموش کسی حد تک غیر منظم اور مبہم قومی احساس کا وہ نقطۂ آغاز تھا جس کے بعد سے ہندوستانی ذہن نے ایک نیا سفر شروع کیا۔ اور گو اس میں قدیم افکار و خیال اور چھوڑی ہوئی منزلوں کی گرد بھی شامل رہی لیکن آگے کی منزلوں میں قدم اٹھاتے وقت ایک نئے شعور کی رہبری ضرور کام آئی۔ اس لئے اس غدر کے بجائے انقلاب کہنا ہی موزوں ہوگا۔ غدر کے موقعے کی کئی تعبیریں اور تفسیریں کی گئی ہیں۔ بعض لوگ اسے فوجیوں کی ایک ناکام بغاوت سے موسوم کرتے ہیں اور کچھ جدید مؤرخ اسے ہندوستانیوں کی پہلی جنگ آزادی لکھتے ہیں۔ یہ دونوں انتہا پسند نظر آتے ہیں۔ ایک معقول تاریخی اور حقیقت پسندانہ نظریہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ کوئی قوم پرستانہ بغاوت نہ تھی اسے انگریزوں کے خلاف ایک منظم اور متحد جد و جہد بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بقول آر سی موجمدار "تمام ہندوستان کی نمائندگی ہرگز نہ کرتی تھی۔ بلکہ مقامی، محدود اور معمولی طریقہ پر منظم تھی"۱

لیکن یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں کے طریقہ کار ان کے حصول اقتدار کے ناجائز اور جابرانہ طور طریقوں سے متاثر ہو کر ہندوستانیوں کے دلوں میں نفرت اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی رسیاسی سماجی

۱۔ این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا (حصّہ سوم) ص ۱۱۲

اور مذہبی وجوہات کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں پرورش پانے والی بے چینی کے پھٹ پڑنے کا یہ لازمی نتیجہ تھا، نفسیاتی اعتبار سے یہ ہنگامہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ اہل ہند کے لئے "انقلاب اندر شعور" کی پہلی منزل تھی اگرچہ قومی بیداری کی اس کروٹ کو دیکھ کر انگریز چوکنے ہو گئے۔ اور انہوں نے کمپنی کے ہاتھوں سے اقتدار کی لگام چھین کر انگلستان کے حاکموں میں سونپ دی اور سارے ہندوستان پر براہ راست تسلط کا بہانہ بنایا اور تمام باقی قوتوں کو کچل کر رکھ دیا تاہم ۱۸۵۷ء کی شورش ان کے لئے ایک درس عبرت سے کم نہ تھی۔

بہرحال غدر کے بعد انگریز بلاشرکت غیرے ہندوستان پر قابض ہو گئے اور اپنے ساتھ اپنی زبان، تہذیب و تمدن عادات و اطوار، خیالات و نظریات بھی لائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غدر سے پہلے کی صدی کی بہ نسبت ان کی معاشرت اور تہذیب کا اثر براہ راست ہندوستانی زندگی پر پڑنے لگا۔ غدر سے پہلے ہندوستانی زندگی نے دھیرے دھیرے مغربی تہذیب کے اثرات قبول کئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے انگریزی تعلیم نافذ ہونے پر انگریزی تہذیب و فکر کے پھیلنے کیلئے راہیں ہموار ہوتی گئیں۔ جبکہ انگریز بنگال پر قابض ہو گئے تو اعلیٰ تعلیم صرف کلاسیکی زبان و ادب کے مطالعے تک محدود تھی۔ اس کے علاوہ گرائمر، منطق، فقہ، قانون اور فلسفہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مکتبوں اور پاٹ شالوں میں مذہبی قصے کہانیوں کی معمولی سی جان پہچان کرائی جاتی تھی۔ اہل کو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی تعلیمی ترقی کا کچھ حال معلوم نہ تھا۔ وہ سائینسی علوم سے متعلق بے بہرہ تھے۔ انگریزوں نے جب دیکھا کہ یہاں کے لوگ تعلیم کے میدان میں بہت پسماندہ ہیں اور عام لوگ جہالت کی تاریکی میں گرے ہوئے ہیں۔ تو سب سے پہلے عیسائی مشنریوں نے انگریزی تعلیم رائج کرنے کی طرف توجہ کی۔ ولیم کیرے ۱۷۹۲ء میں کلکتہ آیا اور وہاں ایک انگریزی سکول کھولنے میں گہری دلچسپی لی۔ ۱۸۱۳ء میں حکومتِ برطانیہ نے ایک لاکھ روپیہ اہل ہند کی تعلیم کیلئے منظور کیا۔ ۱۸۲۰ء میں کلکتہ میں ایک کالج کھولا گیا۔ جہاں انگریزی علوم اور ادبیات کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ ۱۸۳۵ء میں انگریزی ادب اور سائینس کی تعلیم کے لئے انگریزی زبان ذریعہ تصور کی گئی۔ بعد میں ۱۸۶۱ء میں ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں جدید طرز کی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور چند سال کے بعد دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح کی یونیورسٹیاں کھول گئیں۔

انگریزی تعلیم کی اس تاریخی ترقی سے اس دور میں (۱۷۵۷، ۱۸۵۷) لوگوں کے سماجی، مذہبی اور تعلیمی خیالات میں آہستہ آہستہ تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ یہاں کے لوگ صدیوں کے خواب غفلت سے بیدار ہونے لگے۔ توہم پرستی، اندھے عقاید، بے عملی، بے زاری اور مذہبی جنون کے کم ہونے کے ساتھ ساتھ اب فکر و نظر کی روشنی عقل و ادراک، حرکت و عمل اور مذہبی رواداری کی قدروں کا احساس ہونے لگا۔ لیکن یہ بات یہاں پر یاد رکھنی چاہیے۔ کہ یہ ذہنی بیداری اور فکری انقلاب ابھی عام نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ایک محدود طبقے تک محدود تھا

غدر کے بعد انگریزی معاشرت اور تہذیب براہ راست ہندوستانی زندگی پر اثر انداز ہونے لگی۔ اس سلسلے میں حسن یحییٰ عندلیب اپنے مقالے "اردو ادب پر انگریزی ادب کا اثر" میں لکھتے ہیں:

"انگریزی حکومت کے قیام نے عام ملک میں ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں مغربی خیالات مخصوصاً انگریزی نظریات زندگی رفتہ رفتہ لوگوں کے دماغ پر طاری ہونے لگے۔ انگریزی مدرسوں کے قایم ہو جانے سے جہاں انگریزی ذریعۂ تعلیم مقرر کر دی گئی تھی۔ لوگوں کے خیالات پر تغیر و تبدل پیدا ہونے لگا۔" ؂۱

تعلیم کا نیا نظام ٹھوس عقلی بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ ۱۸۸۲ء میں سر ولیم ہنٹر کی سرکردگی میں ایک کمیشن قایم کیا گیا۔ جس نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ اور ملک میں پرائمری تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں تعلیم کی باقاعدہ ترقی کے ساتھ ساتھ سماجی اور مذہبی اصلاحات کی طرف بھی خاص توجہ دی جانے لگی۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہر قدم پر رکاوٹیں تھیں۔ اہل ہند ابھی تک جہالت، بے عملی اور توہم پرستی کے شکار تھے۔ تہذیب کی اصلی قدریں ان میں ختم ہو چکی تھیں۔ جاگیردارانہ نظام کے دور زوال میں تہذیب و شایستگی کا مفہوم ظاہرداری، تکلف و تصنع کھوکھلے اخلاقی اور سماجی تصورات کے سوا کچھ بھی نہ رہ گیا تھا۔ عام لوگ انگریزی تعلیم اور تہذیب کے خالف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا اپنے مذہب سے کنارہ کشی کرنے کے مترادف تھا۔ ان کے اخلاقی تصورات پر ڈاکہ ڈالنا ہے۔ اسی لئے وہ انگریزوں اور ان کے متعلق ہر چیز سے بیزار تھے۔ ان سے دل ہی دل میں نفرت کرتے تھے۔ لیکن ہونٹوں تک صرف شکایت، لانا ان کی ہمت کے باہر تھا۔ انگریزوں کے ملک گیر اقتدار کے سامنے انہیں گھٹنے ٹیکنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ انگریزوں نے دوراندیشی اور حکمت عملی سے کام لیکر انگریزی تعلیم ہندوستان میں اس لئے رائج کی تھی کہ یہاں کے لوگ جہالت اور توہم پرستی سے نکل جائیں۔ اور مغربی تہذیب و فکر کو دل و جان سے قبول کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا ذہن ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی انگریزی خیالات سے دور نہ ہو۔ یہ تو انگریزوں کا مطمح نظر تھا۔ لیکن انگریزی تعلیم کی تدریجی ترقی کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشعور لوگوں نے اچھی طرح جان لیا کہ انگریزی تعلیم آزاد خیالی اور وسیع المشربی کے انداز رکھتی ہے یہ تعلیم پسماندہ ہندوستانیوں کو سائنسی علوم سے آگاہ کر کے ان کے قلب و نظر اور شعور کو بیداری بخش سکتی ہے۔ اس لئے انہوں نے انگریزی تعلیم و تہذیب سے پورا استفادہ کرنے کے لئے کمر باندھی۔ انگریزی اقتدار سے جو غدر کے بعد ایک تاریخی حقیقت بن چکا تھا پورا پورا فایدہ اٹھانا عقلمندی کا ثبوت دینا تھا

ہندوؤں میں ایسے باشعور اور بیدار مغز لوگوں میں راجہ رام موہن رائے کا نام سرفہرست ہے اور مغربی تعلیم کی برکتوں کے مداح تھے اور انہوں نے ملک میں مغربی تعلیم کے فروغ کے لئے کوششیں کیں۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستانیوں کی جہالت کی تاریکی صرف تعلیم کی روشنی سے مٹ سکتی ہے۔ مغربی تعلیم نے انہیں عقلیت کا لحاظ

؂۱ اردو ادب پر انگریزی ادب کا اثر ص ۱۲ اردو جنوری ۱۹۶۴ء

اور حقیقت پسندی عطا کی تھی۔ اس لئے راجہ رام موہن رائے نے اپنی معاشرتی زندگی ہندوؤں کی سماجی اور مذہبی برائیوں اور غلط کاریوں کی روک تھام کے لئے وقف کر دی۔ انہوں نے مذہب کو توہم پرستی اور رواج پرستی سے پاک کرنے کیلئے اصلی پرانوں اور ویدوں کے متن بنگالی زبان میں ترجمہ کرکے اور ۱۸۲۸ء میں مذہبی اصلاح کے لئے برہمو کام کی بنیاد ڈالی۔ سیاسی میدان میں راجہ رام موہن رائے نے آئینی طور پر حکومت سے قومی مطالبے منوا لینے کی مہم شروع کی جو آگے چل کر تحریکوں کے لئے راستہ ہموار کر گئی۔

محمد یوسف ٹینگ

کشمیری زبان اور اُردو

کشمیری زبان کے معاصر شعراء کی پہلی صف میں رحمان راہی، امین کامل اور مظفر عازم نمایاں ہیں۔ ان شعراء کے مطبوعہ مجموعوں کو اٹھا لیجئے۔ تو جہاں رحمان راہی کے کلام میں یہ شعر پڑھکر

ع آدمس ازلے ہیوٚ حُسنک طلب — ہُمزِ ہوٚ لُوٚدُن کعبہ گوٚرُن بُت خانہ تے

(آدم کو ازل ہی سے حُسن کا چسکا پڑ گیا تھا۔ — کبھی کعبہ تعمیر کیا تو کبھی صنم خانے تراشے)

مرزا غالب کا یہ شعر پردۂ ذہن پر اُبھرے گا ع

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا — واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

وہاں امین کامل کا یہ شعر پڑھ کر ع

وائے لم اَشہ قطرہ، دم پھٹو، کم نصیب — فاتھ نہ ییم زاہ نہ دامنس تام

(ہائے وہ کم بخت اور دم بہ خود آنسو کے خطرے! جو داماں تک کبھی نہ پہونچے)

میر تقی میر کے اس شعر کی یاد تازہ ہو جائے گی ع — دل نہ پہونچا گوشۂ داماں تلک

قطرۂ خوں تھا مژہ پہ جم گیا

اور مظفر عازم کا یہ شعر ع

تِھیانہ پیٚالک سے چھُوتسے اوٚش پُس میٚہ ٹارِہن تُرھا یہ ہو کھی

کاتھِہ یزیداہ پہرہ دِتھ دوٚزلیس یہ چھا آب فرات

(میرے پیالے کی سے وہ آنسو ہیں جو پپوٹوں میں ہی خشک ہو گئے۔ یہ کیا کوئی آب فرات ہے کہ کوئی یزید اس پر پہرہ بٹھاوے)

کسی اُردو شاعر، جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا، کے اس شعر کے نقش اُبھار دے گا۔ ع

پھر محتسب نے میکدے کو بند کر لیا

بٹھلا دیا یزید نے پہرہ فرات پہ

کشمیری شعراء نے اُردو کے اشعار کا خیال یا ان کا استفادہ کرکے بعد میں انہیں نئی معنویت کے ساتھ

اپنی زبان میں ہوتا ہے۔ لیکن اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کشمیری شاعری اور اُردو شاعری کی فضا میں آج بھی کس قدر ہم آہنگی اور باطنی اور ظاہری تعلق موجود ہے۔ ایک سا لب و لہجہ، ایک سی فضا ایک سا اسلوب۔ یہ شعر بڑی روا روی میں کھنچے گئے ہیں۔ یوں تو معاصر کشمیری شعراء کے کلام میں اس قسم اور اس سے زیادہ واضح بیسیوں مثالیں نقل کی جاسکتی ہیں۔ اور یہ بات کوئی حُسنِ اتفاق نہیں ہے بلکہ ایک گہری تاریخی صداقت کی شہادت ہے۔ وہ تاریخی صداقت یہ ہے کہ گذشتہ ایک صدی میں اُردو نے کشمیری زبان اور اس کے ادبی ورثے پر بڑے طاقتور اثرات مرتب کئے ہیں۔ اور موجودہ کشمیری ادب کا کوئی جائزہ اس وقت تک بصیرت افروز اور سچائی سے قریب نہیں ہو سکتا جب تک ان دو زبانوں کے اس رشتہ اُلفت کی تفہیم پیدا نہ کی جائے۔

کشمیری پر کسی دوسری زبان کے اثر اور تسلط کا سلسلہ دراصل کشمیری قوم کی تاریخ کے عبرت ناک نشیب و فراز کا ایک آئینہ ہے۔ "یاروں" نے بہت زور مارا تھا کہ کشمیری زبان کو سنسکرت کی بارگاہِ دولت کی ایک ادنے داسی ثابت کر دیں۔ ان لوگوں کا مُدعائے سُخن یہ تھا کہ کشمیری زبان، دراصل سنسکرت کے وشال سرچشمے کی ایک چھوٹی سی آب جو ہے جس کا اپنا کوئی الگ وجود نہیں۔ لیکن یہ مفروضہ غلط ثابت ہو چکا ہے اور یہ بات سامنے آگئی ہے کہ سنسکرت اور کشمیری کا اصل رشتہ دراصل مالکن اور داسی کا نہیں بلکہ دو جڑواں بہنوں کا ہو سکتا ہے جو الگ الگ ماحول میں پلیں، بڑھیں اور اپنی خصوصیات سے بہرہ ور ہوئیں۔ حقیقتاً کشمیری زبان کے الفاظ، اس کی لسانی ساخت اور اس کے HARD CORE کی قدامت سنسکرت کے سانچوں کی گرفت میں نہیں آتی۔ اور بار بار پکار اُٹھتی ہے کہ میں کسی اور منبع کی لہر ہوں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ سنسکرت بولنے والے حکمرانوں نے جب کشمیر پر غلبہ حاصل کر لیا۔ تو انہوں نے اپنی تسخیر کی حدود زبان و لسان کی وادیوں میں بھی پھیلانے کی طرف پوری پوری توجہ کی۔ اور یہ ہر فاتح قوم کا وطیرہ رہا چلا آیا ہے۔ ہماری زبان کا یہ دھارا صدیوں اور قرنوں تک ماقبل تاریخ کی ظلمت کے نیچے ہی نیچے بہہ کر اس ویری ناگ کی صورت میں پہلی بار سطح زمین پر نمودار ہوتا ہے۔ جسے دُنیا للہ دید کے نام سے پہچانتی ہے۔ اور للہ دید کی زبان سنسکرت کے اس گراں بار بوجھ کے نیچے ہانپتی ہوئی نظر آتی ہے سنسکرت بولنے والے حکمرانوں کے طویل عرصے میں کشمیریوں کو "پشاچ" اور "ملیچھ" (بد) ذات کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ان کی زبان بھی اگر موردِ عتاب رہی۔ تو یہ کوئی حیرت انگیز امر نہ تھا۔ درباری سرپرستی کی بات ہی نہیں، بلکہ شاہی غضب کا نشانہ بن کر بھی اگر یہ زبان زندہ رہ سکی۔ تو اسے اس کی سخت جانی پر تعبیر کیا جانا چاہیے۔ اس کے بعد حکمرانوں کی ادلا بدلی رونما ہوئی اور سنسکرت بولنے والوں کی بجائے فارسی بولنے والوں کے ہاتھ میں شمشیر آگئی۔ کشمیری زبان پر اس نئے طلوع کا فوری اثر ہوا۔ اگرچہ ابتدا میں فارسی کے تازہ لمس سے کشمیری زبان کا وہ زنگار بڑی حد تک اُتر گیا جو سنسکرت کے بے رحم تسلط نے اس پر لگا دیا تھا۔ لیکن جلد ہی نئی زبان اخلاق اور مروّت کے یہ آداب بھول کر فاتحانہ حقوق کی طلب گار ہو گئی اور پیرِ تسمہ پا کی طرح سنسکرت کی

جگہ مظلوم کشمیری کی گردن پر سوار ہوگئی ۔ درباروں میں تو اس بے چاری کو کبھی رسائی نہ تھی لیکن عام زندگی میں بھی اس پر فقرے کسے جانے لگے اور تحریر کے معاملے میں تو اس کا باقاعدہ مذاق اڑایا جاتا رہا۔ اسی دور میں ابو الفضل جیسا "روشن دماغ" صاحب قلم کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے

" در کار کشمیر ہمہ خوب اند، بہ جز کشمیریاں" ظاہر ہے کہ جو لوگ ٹھیک نہیں ہوں گے۔ اُن کی زبان کس شمار و قطار میں ہوگی ؟ اگرچہ لوک گیتوں۔ حبہ خاتون اور ارنی مال کے نغموں، (جن کی حقیقت آج تک مشکوک ہے) کی صورت میں یہ زبان کسی نہ کسی طرح جدوجہد لبقاء کا ثبوت دیتی رہی لیکن درحقیقت اسکے احیاء کی اصل بنیاد اُس وقت پڑی۔ جب ۱۸۱۹ء میں فارسی بولنے والے حکمرانوں (پٹھانوں) کو کشمیر میں آخری اور فیصلہ کن شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارے نئے حکمران سکھ اور ڈوگرے اگرچہ تیغ و سناں کے ہتھیاروں سے مسلح تھے لیکن ان کی بڑی کم نصیبی جس کا درماں اُن کے بس سے باہر تھا، یہ تھی کہ وہ جو زبانیں بولتے تھے۔ وہ کشمیری سے کسی صورت میں زیادہ طاقت ور نہیں تھیں اور قدامت کے معاملے میں تو خیر کشمیری کے آگے ان کی کوئی مجال نہیں تھی۔ فارسی کا چسکا تو کشمیریوں کو لگ گیا تھا اور غلامی کا ضابطہء اخلاق ترک کرنا کوئی اختیاری بات نہیں ہوتی لیکن یہ بات معنی خیز ہے کہ جوں ہی فارسی دربار کے سہاروں سے محروم ہوگئی۔ کشمیری زبان میں ادب پیدا کرنے والوں کا ایک پورا کارواں پیدا ہوگیا۔ اسی زمانے میں محمود گامی، مقبول کرالہ واری، رسول میر، پرمانند، ولی اللہ متو اور دوسرے ادبی پیشروؤں کا ظہور ہوتا ہے۔ اور یہی زمانہ کشمیری کے ساتھ اُردو کی جان پہچان کا بھی ہے۔

اُردو کشمیر میں تلوار اور راج کے سایے میں نہیں آئی اور نہ اسنے کبھی جبر اور استبداد کے سہاروں کی طرف نظریں اٹھائیں۔ فارسی کے صدیوں غلبے کے تحت کشمیری زبان کا ایک ایسا مزاج تیار ہوگیا تھا جو اسے اردو کے ساتھ مصافحہ کرنے کے لئے مکمل طور تیار کر گیا تھا۔ ہندوستان کے مراکزِ اقتدار سے تال میل اور خود کشمیر میں فارسی کے زوال اور اس کے مٹتے ہوئے رواج نے کشمیریوں کو اب اُردو سے روشناس کر دیا۔ ان کا ہند آنا جانا رہتا تھا اور جن مقامات (لاہور، امرتسر، دہلی، لکھنؤ، الہ آباد وغیرہ) پر ان کا زیادہ آنا جانا رہتا تھا۔ وہاں جو زبان پنپ رہی تھی وہ یہی اُردو تھی۔ جسے کسی دربار نے نہ پالا نہ پوسا۔ بلکہ جو عوام کی ضروریات کے نتیجے میں جنمی، اور ہندوستانی تہذیب کے وصال کے نتیجے میں منصۂ شہود پر آگئی۔ ہمارے نئے حکمران اگرچہ درباروں میں فارسی کا سوانگ رچاتے رہے لیکن انہیں عوام سے میل جول کے لئے اس نئی زبان کا استعمال کرنا پڑا۔ اس دور کے کشمیری شعراء کے کلام میں اُردو کے ساتھ اس ابتدائی ربط و تعلق کا نتیجہ عجیب صورتوں میں نظر آتا ہے۔ رسول میر شاہ آبادی کے مختصر سے کلام میں اس قسم کے اشعار بھی کشمیری اشعار کے شانہ بشانہ نظر آتے ہیں۔

ع کیا جامہ لال رنگایا، بنگال سے منگایا سرصاف جہاں سر پہ ظالم عجب ستم گر۔ یا

؎ تیرے مہ رُخ اوپر ہر سیاہی تارے جھکنے پیں نظر حیران ہے اس سے اُٹھ جاوے پیارا

یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ لیکن محمود گامی، مقبول ہرمانند اور ناظم کے یہاں بھی اس قسم کے "ریختہ" آئینہ اشعار جا بجا ملتے ہیں۔ بیسویں صدی کے موڑ پر تو کشمیری شعراء کا منبع فیض واضح طور پر فارسی کی بجائے اردو کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ مہجور نے ۱۹۰۸ء کے لگ بھگ شاعری شروع کی۔ لیکن انہیں اردو پر واضح قدرت حاصل تھی۔ اس لئے انہوں نے اردو میں ہی اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ بعد میں جب وہ کشمیری شاعری کی تقدیر زیر و زبر کرنے کے لئے اس طرف مُڑے تو اُس وقت بھی اُردو ادب کے ایوان میں سُنی ہوئی آوازوں کی صدائے بازگشت بار بار سُننے کو ملتی ہے۔ کبھی وہ اس قسم کے مصرعے لکھتے ہیں، جن کا ایک لفظ بدل دیا جائے، تو وہ بالکل اُردو معلوم ہوتے ہیں ؎

حکومت، مال و دولت، ناز و نعمت بیتہ شہنشاہی

اور کبھی "چاند" کو مخاطب کرتے ہوئے 'اقبال' کی اسی نام کی نظم کا تقریباً لفظی ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ عبدالاحد آزاد تو صرف اُردو ہی جانتے تھے اور اس لئے انہوں نے اپنے کلام میں اقبال خصوصاً اور باقی اردو شعراء سے عموماً اکتساب کیا ہے۔ اقبال کی مشہور رُباعی ہے ؎

خدائی اہتمام خشک و تر ہے خداوندا خدائی دردِ سر ہے

ولیکن بندگی استغفر اُللہ یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

آزاد اپنی ایک غزل میں اس بے تکلفی سے اُسے کشمیری لباس میں ڈھال دیتے ہیں ؎

چھُس یہ زانان خود ائی تہ چھہ بوڈ دردِ سرا

بندگی خونِ جگر چون چھُ جناب عالی

(میں جانتا ہوں کہ خدائی بڑا دردِ سر ہے۔ لیکن بندگی تو جناب عالی خون جگر پینے کے برابر ہے)

اس زمانے میں کشمیری زبان کے تقریباً سبھی ادیبوں نے اُردو میں تعلیم حاصل کی۔ اپنی نظر کو اسی زبان میں کشادگی بخشی اور اس زبان کے مے کدے سے سیراب ہو کر کشمیری زبان میں ادب کی سبیل جاری کر دی۔ اردو زبان میں کشمیری کے ارتقاء، اور اس کے ادبی مباحث کے تذکرے پھلتے پھولتے رہے۔ اسی لئے ۱۹۵۰ تک ہمارا سارا تنقیدی اور تحقیقی ادب اُردو کے ذخائر میں ہی دستیاب ہوگا۔ عبدالاحد آزاد نے کشمیری زبان کا سب سے پہلا اور یادگار تذکرہ "کشمیری زبان اور شاعری" اسی زبان میں تخلیق کیا۔ پریم ناتھ بزاز نے آزاد کی شاعری پر کتاب اسی زبان میں لکھی۔ "دتمستا" "خدمت" "ہمدرد" "مارتنڈ" اور دوسرے اخباروں میں اسی زبان کی وساطت سے کشمیری ادب کی ترویج و ترسیل کا کام جاری رہا ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد جن ادیبوں نے کشمیری کی

طرف توجہ کی اور آج اس آسمان کے آفتاب و ماہتاب بنے ہوئے ہیں۔ وہ اُردو کے خیابان سے گلگشت کے بعد ہی اس وادی میں آئے۔ رحمان راہی، غلام رسول نازکی، امین کامل، مظفر عازم، اختر محی الدین، ہنبئی نردوش، علی محمد لون، ہری کرشن کول، غلام رسول سنتوش وغیرہ سبھی لوگ کشمیری میں آنے سے پہلے اُردو میں لکھتے رہے بلکہ بہت سے ادیب تو اس وقت بھی یکساں قدرت کے ساتھ دونوں زبانوں میں لکھ رہے ہیں۔ اور یہ امر اس بات کا غماز ہے کہ ان دو زبانوں کے درمیان کس قدر نزدیکی روابط موجود ہیں۔

اُردو زبان شاعری کے علاوہ کشمیری ادب کی دوسری اصناف پر جو اثر ڈال رہی ہے اس کا اندازہ کشمیری زبان میں لکھی جانے والی موجودہ تنقید سے ہو سکتا ہے کشمیری زبان میں تنقید نگاری کی عمر جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہونے پائی ہے۔ اور اگر ابھی اس نے اپنا کوئی منفرد اسلوب دریافت نہیں کیا ہے تو یہ کوئی مقام عجز نہیں ہے آخر اُردو نے بھی تو اپنے اسی قسم کے دور میں دوسری زبانوں کی بیساکھیاں استعمال کی ہیں۔ لیکن انصاف کا تقاضہ ہے کہ ہم اُردو کی اس اعانت کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہ لیں۔ رحمان راہی کے ایک تنقیدی مضمون کی یہ سطور ملاحظہ ہوں۔ اگر مقفل کو نظر انداز کر دیا جائے تو اُردو کے کسی تنقیدی مضمون سے اسے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یتھ تحقیقگ تہ تدوینگ یہ حال آسہ تیتھ چھ خبرے نہ کا ہہ تنقیدی ہیسے چھ سیٹھے کم گنجایش روزان بہ اگر ونو کین کاشرہ شاعری ہندس موضوعس متعلق کینہہ لیکھہ نگ جرأت کران چھس میہ چھ دراصل شہ سرور بخش احساس آماہ کران۔ یمن زن یہ شاعری پران پران پادہ گژھان چھ۔ تہ امہ منز چھ شہ جمالیاتی تسکین کار فرمایس ینگ بے بدل عطیہ گنز رنہ چھ لیوان۔"

یہ سطور پڑھنے والا عام اردو قادری بھی اس کے معنی سمجھ سکتا ہے۔ اسی مضمون کے صرف ایک پیراگراف میں اُردو کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔ شاعری، نمایندہ، بیشتر غنائی، مراد، تخلیق، داخلی احساس، کیفیت، اظہار براہ راست، بالواسطہ، بعض، ظاہر، خارجی منظر حالت، عکاسی، مختلف، ذاتی تجربہ، تازہ، تخیل، وجود، عطا.... غلام نبی فراق کے ایک تنقیدی مقالے کی یہ سطور بھی دیکھیے۔

" اگرچہ یہ جو رنس روحس چھ ابتدا رپیٹھے حُسنک تلاش آسان تہ حسن تخلیق کرنک طرف آسمان......
کانہہ مخصوص دور چھ تہن بنیادی تبدیلین پیش نظر تھا۔ اہم بنان یہ امہ دورس اندر رومانی سپدنہ بالکل اکہ نوہ زندگی ہند آغاز کران ؟

اس مضمون کی ہر سطر میں اگر بیس الفاظ مان لیے جائیں۔ تو اُن میں سے پندرہ سے زیادہ اُردو کے ہیں اور یہ حال صرف تنقید کا نہیں۔ ہماری شاعری میں بھی یہ اثرات اسی انداز سے نظر آتے ہیں۔ ماسٹر زندہ کول جیسا شاعر

بھی جب "زندہ شاعروں" اور "تلمیذ الرحمٰن" کا ذکر کرتا ہے۔ اُسے اقبال اور حالی ہی یاد آتے ہیں۔ ع

موہتین جذبن چھہ بخشان شاعری نور زندگی — زندہ ہتر دزہ ناد ی ہند کی حالین اقبالیئے
تم چھ — ہمن تلمیذ الرحمٰن ستو بہ ناد — سا قی کنتہ چھی تھو کُھا مس دا تہ نچھ دولہ بالیئے

مظفر عازم کی ایک غزل ہے۔ یہ اُردو سے کس قدر نزدیک ہے اس کا اندازہ ذیل میں دی گئی غزل کے اشعار اور اُن کے متراجم سے ہو گا۔ صرف حروفِ عطف فعل تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔

دِل گو غافل ہے تقصیر	دل ہے غافل اُف تقصیر
دلبر عشقس دعوے گیر	دلبر عشق کا دعوے گیر
خابی دچھہ ہن از منتہ کانہ	خواب میں کاش نظر آئے مجھ کو
خابن ہندین ہُند تابیر	اپنے خوابوں کی تعبیر
میانین زخمن ہُند بلغا	میرے زخموں کا پھاہا
چانین نظرن ہُند اکھ تیر	تیری نظروں کا اک تیر
چانین ٹھارین ہُند شبنم	تیری پلکوں کی شبنم
میانین نالن ہُند تاثیر	میرے نالوں کی تاثیر
پانہ پانین پانے دات	اے دل خود اپنی شدھ لے
اتھ پیٹھ چھنہ میلان تقدیر	اُدھار نہیں ملتی تقدیر
پرانی دُنیا ہین ڈول زنگ	پرانے جگ کا رنگ بدلا
نوز دُنیا ہا کر تعمیر	دُنیا نئی اب کر تعمیر

کچھ عرصے سے بعض حلقوں کی طرف سے اُردو اور کشمیری کا مصنوعی جھگڑا کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ کشمیری زبان غلبے اور تسلط سے اس قدر گھبرا چکی ہے کہ اب بقول کسے مارگزیدہ از انسان والی ذہنیت پیدا ہو جانا غیر قدرتی نہیں یہ بھی صحیح ہے کہ اردو کو کشمیری کی قیمت پر کوئی غلط رعایت نہیں ملنی چاہیے مگر یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ اُردو کشمیریوں نے ایک تاریخی ضرورت کے تحت سیکھی ہے اور جب تک کشمیری زبان اسکی جگہ لینے کی پوری صلاحیت پیدا نہیں کرتی اس وقت تک اُردو ہماری ایک اہم تہذیبی اور تعلیمی ضرورت پورا کرتی رہے گی۔ ایک پورے تہذیبی سرمائے کے ساتھ ہمارا واسطہ اس وقت صرف اُردو کی وساطت سے ہے اور کشمیری تمدن کی موجودہ صورت میں کشمیری کبھی اس ورثے سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے بعض دوست اُردو کے ساتھ "سامراج" اور "ظالم" کے القابات بھی استعمال کرتے ہیں لیکن در اصل نعرہ بازی کا ایک روپ ہے

طرف توجہ کی اور آج اس آسمان کے آفتاب و ماہتاب بنے ہوئے ہیں۔ وہ اردو کے خیابان سے گلگشت کے بعد ہی اس وادی میں آئے۔ رحمان راہی، غلام رسول نازکی، امین کامل، مظفر عازم، اختر محی الدین، ہنسی نردوش، علی محمد لون، ہری کرشن کول، غلام رسول سنتوش وغیرہ سبھی لوگ کشمیری میں آنے سے پہلے اردو میں لکھتے رہے بلکہ بہت سے ادیب تو اس وقت بھی یکساں قدرت کے ساتھ دونوں زبانوں میں لکھ رہے ہیں۔ اور یہ امر اس بات کا غماز ہے کہ ان دو زبانوں کے درمیان کس قدر نزدیکی روابط موجود ہیں۔

اردو زبان شاعری کے علاوہ کشمیری ادب کی دوسری اصناف پر جو اثر ڈال رہی ہے اس کا اندازہ کشمیری زبان میں لکھی جانے والی موجودہ تنقید سے ہو سکتا ہے کیونکہ کشمیری زبان میں تنقید نگاری کی عمر جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہونے پائی ہے۔ اور اگر ابھی اس نے اپنا کوئی منفرد اسلوب دریافت نہیں کیا ہے تو یہ کوئی مقام عجز نہیں ہے آخر اردو نے بھی تو اپنے اسی قسم کے دور میں دوسری زبانوں کی بیساکھیاں استعمال کی ہیں لیکن انصاف کا تقاضہ ہے کہ ہم اردو کی اس اعانت کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہ لیں۔ رحمان راہی کے ایک تنقیدی مضمون کی یہ سطور ملاحظہ ہوں۔ اگر مقل کو نظر انداز کر دیا جائے تو اردو کے کسی تنقیدی مضمون سے اسے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

"یتھ تحقیقک تہ تدوینک یہ حال آسہ تیتھ چھہ خبرے زِ کاہہ تنقیدی ہیچھ چھہ سیٹھاہ کم گنجایش روزان۔ ہۆ اگر وِنی کینہہ کاشرہ شاعری ہندس موضوعس متعلق کینہہ لیکھنہ تگ چھو تہ کران چھس میہ چھہ دراصل سہ سرور بخش احساس آمادہ کران یُس زن یہ شاعری پران پران پانہ گژھان چھہ۔ تہ اتھ منز چھہ سہ تماپیاتی تسکین کارفرمایش کنگ بے بدل عطیہ گنزرنہ چھہ یوان"۔

یہ سطور پڑھنے والا عام اردو داں بھی اس کے معنی کچھ سکتا ہے۔ اسی مضمون کے صرف ایک پیراگراف میں اردو کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔ شاعری، نمائندہ، بیشتر غنائی، مراد، تخلیق، داخلی احساس، کیفیت، اظہار براہ راست، بالواسطہ، بعض، ظاہر، خارجی منظر حالت، عکاسی، مختلف، ذاتی تجربہ، تازہ، تخیل، وجود، عطا... غلام نبی فراق کے ایک تنقیدی مقالے کی یہ سطور بھی دیکھیے۔

" اگرچہ بہجورنس رد حس چھہ ابتدا ریٹھے ژھنک تلاش آسمان تہ حسنِ تخلیقو کرنک ظلوت آسمان.......

کانہہ مخصوص دور چھو تمن بنیادی تبدیلین پیش نظر بتھا۔ اہم نیابان ییہ اتھ دورس اندر روتما سپدیتھ بالکل اکہ نوہ زندگی ہند آغاز کران"۔

اس مضمون کی ہر سطر میں اگر بیس الفاظ مان لئے جائیں۔ تو ان میں سے پندرہ سے زیادہ اردو کے ہیں اور یہ حال صرف تنقید کا نہیں۔ ہماری شاعری میں بھی یہ اثرات اسی انداز سے نظر آتے ہیں۔ ماسٹر زندہ کول جیسا شاعر

بھی جب "زندہ شاعروں" اور "تلمیذالرحمن" کا ذکر کرتا ہے۔ اُسے اقبال اور حالی ہی یاد آتے ہیں۔ ع

موہتین جذبن چھ بخشان شاعری نور زندگی — زندہ ہتی دزہ ناد دی ہند کی حالین اقبالئے

ہم چھ — یمن تلمیذالرحمن شوبہ ناد — ساقی گفتہ چیا تھو کُھ کاس داہ تہ تجہ دلہ بلیئے

مظفر عازم کی ایک غزل ہے۔ یہ اُردو سے کس قدر نزدیک ہے اس کا اندازہ ذیل میں دی گئی غزل کے اشعار اور اُن کے متراجم سے ہوگا۔ صرف حروفِ عطف فعل تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔

دِل گو غافل ہے تقصیر	دل ہے غافل اُف تقصیر
دلبر عشقس دعوے گیر	دلبر عشق کا دعوے گیر
خابی دِچھہن از نتہ کانہہ	خواب میں کاش نظر آئے مجھ کو
خابن ہندین ہُند تاثیر	اپنے خوابوں کی تعبیر
میانین زخمن ہُند بلغار	میرے زخموں کا بھالا
چانین نظرن ہُند اکھ تیر	تیری نظروں کا اک تیر
چانین ٹارین ہُند شبنم	تیری پلکوں کی شبنم
میانین نالن ہُند تاثیر	میرے نالوں کی تاثیر
پانو پانین پانے دات	اے دل خود اپنی شدھ لے
اتھ پیٹھ چھنہ میلان تقدیر	اُدھار نہیں ملتی تقدیر
پرانین دُنیا ین ڈل زنگ	پرانے جگ کا زنگ بدلا
نوو دُنیا ہا کہ تعمیر	دُنیا نئی اب کر تعمیر

کچھ عرصے سے بعض حلقوں کی طرف سے اُردو اور کشمیری کا مصنوعی جھگڑا کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ کشمیری زبان غلبے اور تسلط سے اس قدر گھبرا چکی ہے کہ اب بقول کسے مارگزیدہ از انسان والی ذہنیت پیدا ہونا غیر قدرتی نہیں یہ بھی صحیح ہے کہ اردو کو کشمیری کی قیمت پر کوئی غلط رعایت نہیں ملنی چاہیئے مگر یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ اُردو کشمیریوں نے ایک تاریخی ضرورت کے تحت سیکھی ہے اور جب تک کشمیری زبان اسکی جگہ لینے کی پوری صلاحیت پیدا نہیں کرتی اس وقت تک اُردو ہماری ایک اہم تہذیبی اور تعلیمی ضرورت پورا کرتی رہے گی۔ ایک پورے تہذیبی سرمائے کے ساتھ ہمارا واسطہ اس وقت صرف اُردو کی وساطت سے ہے اور کشمیری تمدن کی موجودہ صورت میں کشمیری کبھی اس ورثے سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے بعض دوست اُردو کے ساتھ "سامراج" اور "ظالم" کے القابات بھی استعمال کرتے ہیں بلکہ دراصل نعرہ بازی کا ایک روپ ہے

اُردو کی پشت پر کوئی ظالمانہ طاقت نہیں ہے۔ وہ ہماری مہمان ہے اور جب ہمیں اس کی ضرورت نہیں رہے گی تو ہم اُسے آسانی سے رخصت کر سکتے ہیں لیکن جو لوگ اس زبان کو رخصت کر کے کشمیری کی بجائے کسی اور زبان کو یہ جگہ دینا چاہتے ہیں وہ کشمیری زبان کے دوست نہیں ہو سکتے۔ اُردو اس وقت ہماری نوشت وخواند اور صحافت کا سب سے بڑا اور عام فہم ذریعہ ہے۔ ہمیں کشمیری میں یہ صلاحیت پیدا کرنی چاہیئے کہ وہ ان اہم شعبوں میں اُردو کی نعم البدل بن سکے۔ سکولوں میں کشمیری زبان کو بڑی مدّت کے بعد داخلہ ملا ہے اور یہ سلسلہ نہ صرف قائم رہنا چاہیئے بلکہ اس میں وسعت آجانی چاہیئے۔ لیکن عبوری دور میں اُردو نہ صرف ہماری ضرورت کا ایک اہم سہارا بلکہ کشمیری زبان کی ترویج وترقی کا بہت بڑا ذریعہ بھی بنی رہے گی۔۔

منظومات

منظور الامین

روح اور چہرا

اے مری جان تو اس درجہ پریشاں کیوں ہے ؟
اتنی بے چین ہے کیوں اتنی ہراساں کیوں ہے ؟
تیرے چہرے پہ تفکر کے نقوش
تیرا چہرا ترے جذبات کا آئینہ ہے
جب ترے قلب پہ پڑتے ہیں غموں کے سائے
تیرا چہرا جو کبھی جھوٹ نہیں کہہ سکتا
ایسی صورت میں وہ خاموش نہیں رہ سکتا
جب تری روح میں در آتا ہے غم
تیرے چہرے سے بھی اندوہ جھلک اٹھتا ہے
دل ہو شاداب تو چہرا شاداب
دل جو روشن ہو تو چہرا بھی گلاب
دل ہو گلزار تو چہرا گلزار
دل ہو سرشار تو چہرے پہ بہار
روح میں کرب تو چہرا غمگیں
دل ہو افسردہ تو چہرا بھی حزیں
تیرے چہرے پہ ترے قلب کی پرچھائیں ہے
بول اٹھے ہیں ترے جذبات ترے چہرے پر
تیرے چہرے پہ تفکر کی گھٹا
یہ ترے حسن کو برباد کئے دیتی ہے
یہ تری روح کو ناشاد کئے دیتی ہے

شہزور کاشمیری

ایک مکالمہ

سوال

میری خطا معاف خداوندِ کائنات
آتی نہیں ہے میری سمجھ میں یہ ایک بات
قانونِ ہست و بود کے رو سے جہان میں
تکمیلِ روحِ عزم و عمل ہے اگر ممات
آتی ہے موت کس لئے پھر ایسے شخص کو
جو جی رہا ہے دہر میں بے مقصدِ حیات؟
ہے مقصدِ حیات ہی اصلِ حیاتِ روح
یعنی مدارِ حوصلۂ دل میں خواہشات
جس دل میں اضطراب نہ ہو خواہشات سے
پیدا کرے وہ کیسے شعورِ غمِ حیات
مفقود جس کے قلب سے ہوں جسیاتِ زیست
کیونکر عمل کی اُس پہ مسلط ہوں کیفیات
جس آدمی کے قلب میں ذوقِ عمل نہ ہو
تکمیلِ روحِ عزم کرے کیسے اس کی ذات

سمجھا تھا میں کہ موت ہے زندوں کے واسطے
مُردوں کی موت؟ یہ تو ہے نادرِ عجائبات!

جواب

زندوں کو اُن کی موت ہے اک نعمتِ حیات
مُردوں کی موت رحمتِ دنیائے ممکنات
زندوں کو اُن کی موت سے آفاقیت نصیب
مُردوں کی موت مرگ ہے یعنی ضدِ حیات

ہے اُن کی موت اصل میں تکمیلِ روحِ عزم
اِن کی اجل شکستِ طلسماتِ ظنیات

عشرت کاشمیری

شیخ العالمؒ

فلسفہ، حکمت، رموزِ علم و عرفاں کا بیاں
چھیڑ دیتا ہے بطرزِ دلنشیں تیرا رباب

دلکش و پُر لطف ہیں اشعارِ معنی آفریں
برگِ گل پر جیسے شبنم جیسے ہو میٹھا سا خواب

یوں اترتا ہے دلِ انساں میں شعرِ پُر اثر
جگمگا دے ظلمتوں کو جیسے برقِ شعلہ تاب

آپ کی تعلیم یہ ہے، آپ کا پیغام یہ
دین و دنیا کے فرائض میں ہو انساں کامیاب

ہے فقط اعمالِ حسنہ سے حیاتِ مستقل
ورنہ ہے بحرِ فنا میں زندگی مثلِ حباب

ہر دم آزاروں پہ پڑھتے آپ استغفار تھے
تھا ریا کاروں سے اکثر آپ کا ہوتا خطاب

نورِ عالم، تیرا فیضاں، گنج بخشِ دو جہاں
آج بھی کشمیر ہے تیرے کرم سے فیضیاب

نور سے تیرے ہو روشن کشتواڑ بد نصیب
آسمانِ سرزمیں کے ہو درخشاں آفتاب

پاک باطن، نیک فطرت، شاعرِ انساں نواز
شیخ نورالدین، عشرتؔ، ہیں ولی لاجواب

فاروق نازکی

دیوارِ شب

پھر شبِ غم ہے وہی اور غمِ دل ہے وہی
آج سے پہلے جو تھی آج بھی مشکل ہے وہی
جانے کیوں روح مری آج لرز اٹھتی ہے
کنجِ زنداں ہے وہی، شورِ سلاسل ہے وہی

یہ گھٹن آج سے پہلے کبھی ایسی تو نہ تھی
اپنی ہی بات گلوگیر ہوئی جاتی ہے
ہونٹ ٹھہرے ہوئے سوکھے ہوئے پتوں کیطرح
سانس لیتی ہوئی زنجیر نظر آتی ہے

رات ایک کوہِ گراں وقت ہے اک سیلِ رواں
کیسی الجھن میں گرفتار ہوا جاتا ہوں
بسترِ خواب پہ تم کتنی بھلی لگتی ہو
اور میں نقش بدیوار ہوا جاتا ہوں

وقت کا سیلِ رواں بہہ بھی چلا اور ابھی
تم وہی نارِ تجلی، برقِ ادا، شعلہ نفس
میرے احساس کے پردوں میں چھپی بیٹھی ہو
میں وہی، زیرِ   اربابِ، خاک بسر

ان گنت لوگوں کی بستی میں بھی خلوت کا اسیر
مجھ سے لوگوں نے مرے درد کو پوچھا بھی نہیں
کوئی چہرہ کوئی آئینہ تو دکھلاؤ ذرا
کب سے خود اپنے خدا خاں کو دیکھا بھی نہیں

جرسِ دل کو ذرا کوئی ہلا کر دیکھو
کب تلک قافلۂ عمرِ رواں ٹھہرے گا
کوئی سایہ نہ کوئی پیڑ، بہت گرمی ہے
روکنے والو بھلا کوئی کہاں ٹھہرے گا

تم نے تو کردہ گناہوں کی جزا پائی ہے
میں نے ناکردہ گناہوں کی سزا پائی ہے

آسماں جیسے تھکا ہارا مسافر کوئی،
اپنے دامن پہ سجائے ہوئے صدیوں کے چراغ،
شام کے موڑ پہ ٹھہرا ہوا تنہا تنہا،

آج کی رات بھی صد گونہ گراں گذری ہے،
آج کی صبح بھی صد گونہ گراں گذرے گی،

کیا سرِ دار کوئی شعلہ نفس پہنچا ہے
کیا انا موت کا پیغام ہوتی جاتی ہے
دستِ سقراط میں پھر زہر بھرا جام نہ دو
یہ ادا باعثِ الزام ہوتی جاتی ہے

شبیب رضوی

بغاوت

میں نے مانا تری خاطر۔ تری فرمائش ہے
کہ میں دُنیا کی کسی چیز سے نفرت نہ کروں
پھر بھی یہ بات نہ مانوں گا، نہ مانوں گا کہ میں
اپنے بکھرے ہوئے افکار سے اُلفت نہ کروں
رسمِ دیرینہ کی سازش میں گرفتار رہوں
دست و بازو کے بھروسے پہ بغاوت نہ کروں
چُپ رہوں روح کی بیمار صدائیں سُن کر
رِستے ناسُور پہ میں مشقِ جراحت نہ کروں
جس سے تاریخ کا اک جُرم گراں ہو جائے
ایسے ماحول کی بھرپُور مذمت نہ کروں
جس سے اقلیمِ محبت کو زوال آ جائے
ایسی کمبخت روائیت کی شکائیت نہ کروں

تیرا یہ مشورہ، یہ حکم نہ مانوں گا کہ میں
اپنے احساس کے چہروں سے بھی نفرت نہ کروں

ڈرامہ

علی محمد لون

چراغ اور سائے

(ڈرامہ)

ھدائیت :- الف :- اندر والی سوچ
ب :- سُننے والی بات

کردار :-

فیروز	خاوند	
رجو	بیوی	
مسلمان	دوست	آواز
منی	بچّی	غیر حاضر
بنٹی	بچّہ	" "

(دھیمی دھیمی اُداس سی موسیقی)

فیروز :- (الف)

میں ایک سورج تھا۔ پُر نور ۔ تابناک اور روشن
میں نے اپنی کرنوں کا بیوپار کیا۔
اپنا نور بانٹتا رہا
اور اب ؟
اور اب میں ایک غار ہوں
تاریک ۔ سرد اور یخ بستہ
میرے سینے میں اندھیروں کا رقص ہوتا ہے۔
اور کوئی بھی میرے درد سے آشنا نہیں

کوئی نہیں
کوئی نہیں
کاش!
میں نے اپنے لئے بھی تھوڑا سا نور
تھوڑی سی حرارت
اور تھوڑی سی حدّت
بچا کے رکھی ہوتی!

(ب، ہا۔ ہاں۔ تم؟ کب آئیں؟

رجو:۔ ابھی آرہی ہوں۔ کیوں میرا مُنہ کیا دیکھ رہے ہو؟

فیروز:۔ کچھ نہیں رجو۔ سوچ رہا ہوں۔

رجو:۔ کیا سوچ رہے ہو فیروز؟

فیروز:۔ یہی کہ یہ دُنیا زندہ رہنے کے قابل ہے یا نہیں۔

رجو:۔ (ذرا بتاؤ) کس نتیجہ پر پہنچے؟

فیروز:۔ (الف) بتاؤں تو ابھی چیخ کر گھر سے باہر بھاگو گی اور کہیں ڈوب مرو گی۔

رجو:۔ (الف) معلوم ہوتا ہے۔ اس کا پاگل پن ابھی تک گیا نہیں۔

فیروز:۔ نتیجہ؟

رجو:۔ ہاں۔

فیروز:۔ جینے کے قابل ہے نہ مرنے کے۔ بس کچھ درمیانی کیفیت سی ہے

رجو:۔ تھینک گاڈ! آج پاگل پن میں کچھ تو کمی نظر آتی ہے۔

فیروز:۔ (الف) میرا درد کوئی بھی نہ جانے
سب مجھ کو پاگل کہیں
پتھر برسائیں
لہو لہان کردیں
میرے خون کا قطرہ قطرہ چاٹ کر
اپنے لئے ایک نئی تبدیلی کا آغاز کریں

ایک نئی دُنیا کی تعمیر کریں.

نئے افق، نئے سُورج اُگائیں.

لیکن میں تنہا

ایک غار کی مانند

تاریک۔ سرد۔ یخ بستہ

اپنے سینے میں رقصاں اندھیروں

روتی چیختی ہواؤں سے سر پھوڑ دوں

(ب)، ہاں آج پاگل پن میں واقعی کمی ہے رجو۔ لیکن اس پاگل پن کو سمجھنا بہت مشکل ہے رجو۔ بہت ہی مشکل۔

رجو:۔ ہوگا

فیروز:۔ ہوگا نہیں رجو۔ ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے ساری دنیا کے علم کی ضرورت ہے۔ خیر ہٹاؤ۔ یہ تو بتاؤ آج چھٹی کے دن تمہارا کیا پروگرام ہے؟

رجو:۔ (الف) پروگرام بتاؤں۔ تو آگ لگ جائے گی بدن میں۔ اور تم اپنی بزدلی کو بھول بھال کر میرا گلا گھونٹ دوگے۔ یا اگر ایسا نہ بھی کر سکو۔ تو کم سے کم سزا یہی دوگے کہ مجھے اس گھر کے ویرانے سے باہر کر دوگے۔ (ب) پروگرام کیا ہو سکتا ہے آج ارادہ ہے کہ دن بھر گھر میں ہی بیٹھا جائے۔

فیروز:۔ کیا کہا؟ گھر میں بیٹھنے کا ارادہ ہے؟

رجو:۔ ہاں۔ لیکن تم چونک کیوں پڑے؟ کیا ایسا ممکن نہیں؟

فیروز:۔ کمال ہے! آج تم اپنی مرضی سے یہاں رہنے کا ارادہ کئے بیٹھی ہو۔

رجو:۔ (الف) تمہاری ان کڑوی کسیلی باتوں سے چڑ کر ہی تو میں یہاں سے اکثر باہر رہتی ہوں اور تمہارا مُنہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ لیکن کیا کروں؟ ایک بھرم قائم رکھنا ہے۔ گھر گرہستی کا۔ بچّوں کی زندگی کا۔ یہ مجبوری نہ ہو تو میں تمہارے مُنہ پر تھوک کر نہ جانے کب کی یہاں سے نکل گئی ہوتی (ب) ہاں۔ تم بھول رہے ہو فیروز۔ ذرا دیکھو تو آج تاریخ کون سی ہے؟

فیروز:۔ (الف) میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ آج ہماری شادی کی پندرھویں سالگرہ ہے۔ اور تم اسی سالگرہ کو بہانہ بنا کر میرے اعصاب پر سوار ہو جانا چاہتی ہو۔ لیکن سُن کے رکھو رجو۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ مجھے تمہارے وجود سے ہی گھن آتی ہے (ب) تاریخ؟ تاریخ تو وہی ہے جو کیلنڈر بتا رہا ہے۔ لیکن

میں کیا نہیں۔ تاریخ کا تمہارے اس عجیب و غریب ارادے کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

(الف) بڑے بھولے بنتے ہو فیروز۔ جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں تمہاری اب ریاکاری کو بھی تھوڑی دیر کے لئے برداشت کر لوں گی۔ (ب) فیروز ڈارلنگ!

ہاں رجو۔

رجو:۔ آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے نا؟

فیروز:۔ ارے ہاں — میں تو بھول ہی گیا تھا۔ کون سی تاریخ تھی وہ بھلا؟

راجو:۔ آج ہی کی تاریخ تھی فیروز (آہ بھر کر) آج ہی کی تاریخ

فیروز:۔ (سانس بھر کر) ہاں۔ آج ہی کی تاریخ تھی رجو۔ (اُداس) آج ہی کی تاریخ (الف) اور پندرہ سال پہلے آج ہی کے دن تم میری زندگی میں آ گئی تھیں۔ اور میں نے اپنے چمکتے دمکتے نورانی سورج کی کرنیں تمہارے قدموں پر نچھاور کی تھیں۔ اپنے سورج کا سارا نور تمہیں سونپ کر اس میں گہن لگا دیا تھا۔ یہ بھول کر کہ کسی دن مجھے ان کرنوں اور اس نور کی بڑی شدت سے ضرورت ہو گی۔ یہ بھول کر کہ کسی دن میری اپنی جھولی میں کچھ بھی نہ رہے گا۔ اور میں ایک تاریک سرد اور یخ بستہ غار میں تبدیل ہو جاؤں گا۔ رجو! تم کیا تھیں۔ کیا ہو گئیں۔ میں کیا تھا۔ کیا بن گیا۔

رجو:۔ کاش۔ بچیاں بھی ہماری اسی خوشی میں شامل ہونے کے لئے یہاں ہوتیں!

فیروز:۔ ہاں اور نہیں تو کیا

رجو:۔ بُرا ہو ان اسکول والوں کا۔ انہی دنوں سمر کیمپ میں لے گئے اُنہیں۔

فیروز:۔ واقعی آج تو انہیں ہمارے درمیان ہونا چاہیئے تھا۔

رجو:۔ فیروز!

فیروز:۔ ہاں۔

رجو:۔ کیا تم اب نہیں کہہ سکتے کہ انہیں صرف دو گھنٹے کے لئے گُل مرگ لے آؤ۔؟

فیروز:۔ نہیں رجو۔ یہ تو اسکول کے ڈسپلن کے خلاف ہو گا۔

رجو:۔ پھر ان کے بغیر سالگرہ کیا خاک منائی جا سکے گی؟

فیروز (الف) سالگرہ! ہُنہ! پتہ نہیں آج کونسا جال بچھنے والا ہے یہاں۔ لیکن رجو! مجھے اتنا بھولا نہ سمجھو۔ میں قدم قدم پہ ہوشیاری برتوں گا۔ بات بات پر چوکتا رہوں گا۔ تم مجھے اب ٹھگ نہیں سکتیں (ب) ہاں وہ تو خیر ٹھیک ہے۔ لیکن اب اس مجبوری کا بھی خیال کرنا۔؟

رجو :- مجبوری! مجبوری!! مجبوری!!! آخر کوئی کہاں تک مجبور رہے؟

فیروز :- جب تک سانس چلتا ہے۔ مجبوری کا ساتھ رہے گا۔

رجو :- لیکن فیروز۔ تم تو جانتے ہی ہو۔ کہ بچیوں کے بغیر؟

فیروز :- (الف) جانتا ہوں رجو۔ وہ نہ ہوتیں۔ تو ہم نے شادی کی تیسری سالگرہ کبھی نہ منائی ہوتی (ب)، جانتا ہوں رجو۔ لیکن اب کیا کریں؟

رجو :- تو پھر کیا کریں؟

فیروز :- میرا کہا مانو گی؟

رجو :- کہو۔

فیروز :- رجو کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ تم —— نہیں تم ناراض ہو گی۔

رجو :- تم نے بات کہی بھی نہیں۔ اور میری ناراضی سے ڈر گئے؟ بولو کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں آج کچھ بھی سننے کے موڈ میں ہوں فیروز۔

فیروز :- تو رجو۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ تم مجھے میرا دیا ہوا تھوڑا سا نور صرف آج دن کے لئے لوٹا دو؟

رجو :- (الف) جانتی ہوں۔ تم کیا چاہتے ہو۔ لیکن یہ اب میرے بس کی بات نہیں ہے فیروز۔ میرے بس سے باہر ہے تم جس نور کی بات کر رہے ہو۔ اسے میں بھی اپنے نور کے ساتھ بڑی فیاضی سے دوسروں میں بانٹتی رہی ہوں اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں خود اندھیروں میں بھٹک رہی ہوں (ب)، جانے تم کس نور کی بات کر رہے ہو؟ میری سمجھ میں تو خاک بھی نہیں آرہا۔

فیروز :- (الف) ہاں ہاں۔ تمہاری سمجھ پر تو شروع ہی سے پتھر پڑے تھے۔ اور تم نے دو دو ہاتھوں سے میرا نور چھیننے کی سازش کی تھی (ب)، اچھا ہٹاؤ۔ یہ تو بتاؤ۔ کہ بچیوں کی غیر موجودگی میں آج پروگرام کیا رہے گا۔؟

رجو :- بس آج ایک دوسرے کے پاس بیٹھے رہیں گے۔

فیروز :- اور ایک دوسرے کو چرکے لگاتے رہیں گے۔ یہی نا؟

رجو :- (الف) میں جس چیز سے ڈر رہی تھی۔ وہی ہو رہی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں نے اس کمرے میں آنے سے پہلے سوچا تھا۔ یہ آج بھی اسی موڈ میں ہیں (ب)، فیروز!

فیروز :- ہاں رجو!

رجو :- کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم آج کے دن اپنی شادی شدہ زندگی کے پندرہ برسوں کو بھول جائیں۔

اور صرف یہ یاد کریں کہ اس زندگی سے پہلے ہم کالج میں ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اور محض دو دوستوں کی طرح رہا کرتے تھے۔

فیروز:۔ ہاں یہ تو ممکن ہو سکتا ہے لیکن

رجو:۔ لیکن کیا؟

فیروز:۔ لیکن جو وقت تب سے اب تک ہمارے سروں سے گذر گیا۔ اُس کا بوجھ اپنے کاندھوں سے جھٹک کر رکھ دیں؟

رجو:۔ وقت کا بوجھ ایک سوچ ہے۔ ایک احساس ہے فیروز۔ صرف آج کے دن اس سوچ اور اس احساس کو بھول کر پھر ایک بار ویسے ہی ہنس مُکھ پیارے پیارے فیروز بن جاؤ۔

فیروز:۔ رجو۔ مان لو۔ میں ویسا ہی فیروز بن بھی جاتا ہوں۔ تو کیا تم بھی ویسی ہی معصوم شوخ اور بھولی بھالی رجو بن پاؤ گی؟

رجو:۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

فیروز:۔ نہیں بن پاؤ گی۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی نہ بن پاؤ گی۔ وقت اپنے امٹ نشان چھوڑ چکا ہے۔ اور وقت بڑی ظالم شے ہے۔ بڑی ظالم شے۔ اس کا احساس کبھی نہیں مٹ سکتا۔ وقت سے لاتعلق ہونا موت کی نشانی ہے۔ اور ہم دونوں خیر سے اب بھی زندہ ہیں۔

راجو:۔ (الف) اور نہ جانے کہاں تک وقت کے اس احساس کے ساتھ زندہ رہیں گے۔ اُف! یہ زندگی واقعی جینے کے قابل نہیں ہے۔ موت اس سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن وقت جب تک ہمارے سروں پر سوار ہے سانس چلتا ہے۔ ہم کیوں بزدلوں کی طرح ایک دوسرے سے چھُپکر چوری چوری اس زندگی میں ذرا سی رنگینی۔ ذرا سی خوشی پیدا کرنے کا گُناہ کریں؟ (ب) تو کیا فیروز۔ کوئی ایسی صُورت نہیں۔ کہ ہم آج کے دن۔ صرف آج ہی کے دن میاں بیوی کی طرح نہ سہی۔ دو دوستوں کی طرح چند لمحے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں؟ اور اپنے دلوں سے سارے شکوک سارے غبار دُور کریں؟

فیروز:۔ (آہ بھر کر) کون جانے رجو۔ کون جانے۔

رجو:۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں نے جو کچھ کیا ہے اُسے تم بھول جاؤ۔ اور جو کچھ تم نے کیا ہے اسے میں بھول جاؤں صرف آج کے لئے۔ صرف آج دن کے لئے فیروز؟

فیروز:۔ (ہنس کر) کوشش کرنے میں کوئی مضائقہ تو نہیں۔ لیکن یہ ایک سب سے بڑی ہپوکریسی ہوگی۔ ریاکاری ہوگی رجو!

رجو:۔ کوئی بات نہیں فیروز۔ لوگ جس ہپوکریسی اور ریاکاری کو بُرا کہتے ہیں۔ میں اسے انسان کی زندگی کا سب سے

بڑا سہارا اور ساتھی مانتی ہوں۔ انسان ساتھ دیں نہ دیں۔ اس کی ریاکاری اس کا ہمیشہ ساتھ دیتی ہے بالکل تمہارے کتے پنکی کی طرح۔

فیروز:۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ ریاکاری نہ ہو تو انسان شائد ایک لمحے کے لئے بھی زندہ نہ رہ سکے۔ اب تم اپنی ہی مثال لو۔ ہم نے ایک دوسرے کو کیا دیا؟

رجو:۔ سب کچھ دینے پر بھی کچھ نہ دیا فیروز۔

فیروز:۔ اور ہم دونوں دنیا کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنی زندگی سونپ دی ہے اور یہ بے وقوف دُنیا والے ہمیں خوش نصیب جوڑا کہتے ہیں۔
آئیڈیل کپل! ہاہاہا! وٹ ہپوکریسی! ہیل ہپوکریسی!

رجو:۔ میں نہ کہتی تھی؟

فیروز:۔ ہاں رجو۔ یہ اسی ریاکاری کا صدقہ ہے کہ ہم اس سوسائٹی میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ورنہ ہم کیا کچھ نہیں۔ کوئی جانے تو۔۔۔ خیر ہٹاؤ اس بات کو رجو۔ یہ بتاؤ کہ کیا ہم واقعی چند لمحوں کے لئے دوستوں کی طرح رہ سکتے ہیں؟

رجو:۔ کیوں نہیں رہ سکتے فیروز

فیروز:۔ ویری گڈ! تو رجو۔ یہ تو بتاؤ کہ تمہیں ان چند لمحوں تک رجھانے کے لیے میں تمہارے لئے کونسا تحفہ دوں؟

رجو:۔ مجھے تحفوں کی ضرورت نہیں ہے فیروز۔

فیروز:۔ نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہوگا۔ برسوں کے بعد ہم ایک بار پھر دوستوں کی طرح ملے ہیں۔ تو پھر تحفہ کے بغیر کیسے چلے گا سلسلہ۔

رجو:۔ پلیز فیروز۔ ڈونٹ بی سو فورمل!

فیروز:۔ نہیں رجو۔ نہیں چلے گا۔ اچھا میں سفید گلاب کا یہ پھول تمہارے جوڑے میں لگاتا ہوں۔ یا تم کہو۔ تو ابھی گاڑی دوڑا کر تمہاری اس سبز ریشمی ساری کے لئے کوئی خوبصورت سنہرے رنگ کا پن لے آؤں۔ یا اگر اس میں وقت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے تو اب ایسا کرو کہ اپنے ہونٹ میری طرف بڑھا دو!

رجو:۔ فیروز!

فیروز:۔ ہاں رجو۔ میں تمہیں اپنی باہنوں میں لے کر ایک بار پھر تمہارے ہونٹوں کا آب حیات پینا چاہتا ہوں اور یہ بھول جانا چاہتا ہوں کہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ تمہارے بچوں کا باپ۔ میں صرف یہ یاد کرنا چاہتا ہوں۔ کہ تم رجو ہو۔ پندرہ سال پہلے کی رجو۔ شوخ، چنچل۔ بھولی بھالی رجو۔ بولو۔ چپ کیوں ہو گئیں؟

رجو :۔ (الف) جی چاہتا ہے۔ کہ تمہاری ان باتوں کے لئے تمہارا منہ چوم لوں۔ تم سے جی بھر کر پیار کر لوں۔ آخری بار تمہاری باہوں میں سمٹ کر اپنی جان دے دوں۔ اسی احساس کے ساتھ مر جاؤں۔ کہ میں نے مرتے مرتے تم سے بڑے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ پیار کیا تھا۔ تب میری روح بے قرار نہ رہے گی۔ اور شانت ہو کر کسی ان دیکھے اجالے یا کسی ان بوجھے اندھیرے غار میں کھو جائے گی۔ کاش! کاش! نہیں رجو! پاؤں روک لے اپنے۔ پاگل نہ بن (ب) ہٹاؤ فیروز تم تو مجھے بنانے لگے۔ یہ باتیں اب ہمیں زیب نہیں دیتیں!

فیروز :۔ پھر کیا ہوگا پھر کیا ہوگا رجو؟ پھر ہم ایک دوسرے کے ساتھ یہ پہاڑ سا دن کیسے کاٹ سکیں گے۔؟ (الف) فیروز! اپنے جذبات کو قابو میں رکھ لو۔ تم ان بالوں میں گلاب کا پھول نہیں لگا سکتے۔ کہ یہ کئی ہاتھوں سے کھیلتے آئے ہیں۔ تم اس ساری میں پن کبھی نہیں لگا سکتے۔ کہ یہ ساری تمہاری اپنی خریدی ہوئی نہیں ہے۔ تم ان ہونٹوں کا آب حیات کبھی نہیں پی سکتے۔ کہ ان پر اب بھی کئی ہونٹوں کے نشان باقی ہیں۔ ہمت کرو فیروز۔ رجو تمہاری بیوی ہے۔ تمہاری محبوبہ نہیں۔ محبوبہ کی لغزشیں معاف کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ایک بیوی کی لغزش معاف نہیں کی جا سکتی۔ رجو تمہاری بیوی ہے۔ تمہاری محبوبہ رجو تو کب کا مر گئی۔ (ب) پھر کیا کریں رجو؟ تم ہی کوئی راہ سمجھا دو۔

رجو :۔ آؤ ریڈیو گرام پر رقص کی دھنیں بجائیں۔

فیروز :۔ (خوش ہو کر) اور رقص کریں۔ اے میری ہم رقص مجھ کو تھام لے (زور سے ہنستا ہے) ہا ہا ہا! (پھر رک کر) لیکن رجو۔ لیکن۔

رجو :۔ لیکن کیا؟ (الف) سوچنا ہوگا کہ رقص میں رجو کے جسم کے ساتھ جسم ٹکرانا ہوگا۔ شانوں پر اس کی زلفوں کو بکھرانا ہوگا۔ چہرے پر اس کی سانسوں کو سہنا ہوگا۔ اور پھر مارے دہشت کے سر موڑ کر کیلنڈر میں آج کی تاریخ دیکھنا ہوگی۔ (ب) ہاں ہاں لیکن کیا؟ پلیز فیروز! لیٹ می!

فیروز :۔ آل رائٹ رجو! آل رائٹ۔ چلو یہ گر بھی آزماتے ہیں۔

رجو :۔ تھینک یو فیروز۔ کون سا ریکارڈ لگاؤں پہلے؟

فیروز :۔ کوئی ہلکا پھلکا والٹز لگا دو رجو۔

رجو :۔ کیوں کوئی فاسٹ ردم والا ریکارڈز نہ لگائیں؟

فیروز :۔ جیسی تمہاری مرضی

رجو :۔ اچھا ہٹاؤ تم کہتے ہو تو یہ والٹز ہی لگاتی ہوں پہلے۔ لیکن دوسرا ریکارڈ وہی فاسٹ ردم والا رکھو رہی ہوں۔ ہوں؟

بڑا سہارا اور ساتھی مانتی ہوں۔ انسان ساتھ دیں نہ دیں۔ اس کی ریاکاری اس کا ہمیشہ ساتھ دیتی ہے بالکل تمہارے کتے پنکی کی طرح۔

فیروز:۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ ریاکاری نہ ہو تو انسان شائد ایک لمحے کے لئے بھی زندہ نہ رہ سکے۔ اب تم اپنی ہی مثال لو۔ ہم نے ایک دوسرے کو کیا دیا؟

رجو:۔ سب کچھ دینے پر بھی کچھ نہ دیا فیروز۔

فیروز:۔ اور ہم دونوں دنیا کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنی زندگی سونپ دی ہے اور یہ بے وقوف دُنیا والے ہمیں خوش نصیب جوڑا کہتے ہیں۔
آئڈیل کپل! ہاہاہا! وٹ ہپوکریسی! ہیل ہپوکریسی!

رجو:۔ میں نہ کہتی تھی؟

فیروز:۔ ہاں رجو۔ یہ اسی ریاکاری کا صدقہ ہے کہ ہم اس سوسائٹی میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ورنہ ہم کیا کچھ نہیں۔ کوئی جانے تو — خیر ہٹاؤ اس بات کو رجو۔ یہ بتاؤ کہ کیا ہم واقعی چند لمحوں کے لئے دوستوں کی طرح رہ سکتے ہیں؟

رجو:۔ کیوں نہیں رہ سکتے فیروز

فیروز:۔ ویری گڈ! تو رجو۔ یہ تو بتاؤ کہ تمہیں ان چند لمحوں تک رجھانے کے لئے میں تمہارے لئے کونسا تحفہ دوں؟

رجو:۔ مجھے تحفوں کی ضرورت نہیں ہے فیروز۔

فیروز:۔ نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہوگا۔ برسوں کے بعد ہم ایک بار پھر دوستوں کی طرح ملے ہیں۔ تو پھر تحفہ کے بغیر کیسے چلے گا سلسلہ۔

رجو:۔ پلیز فیروز۔ ڈونٹ بی سو فورمل!

فیروز:۔ نہیں رجو۔ نہیں چلے گا۔ اچھا میں سفید گلاب کا یہ پھول تمہارے جوڑے میں لگاتا ہوں۔ یا تم کہو۔ تو ابھی گاڑی دوڑا کر تمہاری اس سبز ریشمی ساری کے لئے کوئی خوبصورت سنہرے رنگ کا پن لے آؤں۔ یا اگر اس میں وقت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے تو آؤ کر کہ اپنے ہونٹ میری طرف بڑھا دو!

رجو:۔ فیروز!

فیروز:۔ ہاں رجو۔ میں تمہیں اپنی باہوں میں لے کر ایک بار پھر تمہارے ہونٹوں کا آب حیات پینا چاہتا ہوں اور یہ بھول جانا چاہتا ہوں کہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ تمہارے بچوں کا باپ۔ میں صرف یہ یاد کرنا چاہتا ہوں۔ کہ تم رجو ہو۔ پندرہ سال پہلے کی رجو۔ شوخ، چنچل۔ بھولی بھالی رجو۔ بولو۔ چپ کیوں ہو گئیں؟

رجو :۔ (الف، جی چاہتا ہے۔ کہ تمہاری ان باتوں کے لئے تمہارا منہ چوم لوں۔ تم سے جی بھر کر پیار کر لوں۔
آخری بار تمہاری بانہوں میں سمٹ کر اپنی جان دے دوں۔ اسی احساس کے ساتھ مر جاؤں۔ کہ میں نے مرتے مرتے
تم سے بڑے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ پیار کیا تھا۔ تب میری روح بے قرار نہ رہے گی۔ اور شانت
ہو کر کسی ان دیکھے اُجالے یا کسی ان بوجھے اندھیرے غار میں کھو جائے گی۔ کاش! کاش! نہیں رجو!
پاؤں روک لے اپنے۔ پاگل نہ بن (ب) ہٹاؤ فیروز تم تو مجھے بنانے لگے۔ یہ باتیں اب ہمیں زیب نہیں دیتیں!

فیروز :۔ پھر کیا ہوگا پھر کیا ہوگا رجو؟ پھر ہم ایک دوسرے کے ساتھ یہ پہاڑ سا دن کیسے کاٹ سکیں گے۔؟
(الف، فیروز! اپنے جذبات کو قابو میں رکھ لو۔ تم ان بالوں میں گلاب کا پھول نہیں لگا سکتے۔ کہ یہ
کئی ہاتھوں سے کھیلتے آئے ہیں۔ تم اس ساری میں پن کبھی نہیں لگا سکتے۔ کہ یہ ساری تمہاری اپنی خریدی
ہوئی نہیں ہے۔ تم ان ہونٹوں کا آب حیات کبھی نہیں پی سکتے۔ کہ ان پر اب بھی کئی ہونٹوں کے نشان باقی ہیں۔
ہمت کھو لو فیروز۔ رجو تمہاری بیوی ہے۔ تمہاری محبوبہ نہیں۔ محبوبہ کی لغزشیں معاف کی جا سکتی ہیں۔ لیکن
ایک بیوی کی لغزشیں معاف نہیں کی جا سکتی۔ رجو تمہاری بیوی ہے۔ تمہاری محبوبہ رجو تو کب کا مر گئی۔ (ب،
پھر کیا کریں رجو؟ تم ہی کوئی راہ سمجھا دو۔

رجو :۔ آؤ ریڈیو گرام پر رقص کی دھنیں بجائیں۔

فیروز :۔ (خوش ہو کر) اور رقص کریں۔ اے میری ہم رقص مجھ کو تھام لے (زور سے ہنستا ہے) ہاہاہا! (پھر
رک کر) لیکن رجو۔ لیکن۔

رجو :۔ لیکن کیا؟ (الف) سوچنا ہوگا کہ رقص میں رجو کے جسم کے ساتھ جسم ٹکرانا ہوگا۔ شانوں پر اس کی
زلفوں کو بکھرانا ہوگا۔ چہرے پر اس کی سانسوں کو سہنا ہوگا۔ اور پھر مارے وحشت کے سر موڑ کر کیلنڈر
میں آج کی تاریخ دیکھنا ہوگی۔ (ب) ہاں ہاں۔ لیکن کیا؟ پلیز فیروز! لیٹ می!

فیروز :۔ آل رائٹ رجو! آل رائٹ۔ چلو یہ گر بھی آزماتے ہیں۔

رجو :۔ تھینک یو فیروز۔ کون سا ریکارڈ لگاؤں پہلے؟

فیروز :۔ کوئی ہلکا پھلکا والٹز لگا دو رجو۔

رجو :۔ کیوں کوئی فاسٹ ردم والا ریکارڈ نہ لگائیں؟

فیروز :۔ جیسی تمہاری مرضی

رجو :۔ اچھا ہٹاؤ۔ تم کہتے ہو تو یہ والٹز ہی لگاتی ہوں پہلے۔ لیکن دوسرا ریکارڈ وہی فاسٹ ردم والا رکھ رہی
ہوں۔ ہوں؟

بڑا سہارا اور ساتھی مانتی ہوں۔ انسان ساتھ دیں نہ دیں۔ اس کی ریاکاری اس کا ہمیشہ ساتھ دیتی ہے بالکل تمہارے کتے پنکی کی طرح۔

فیروز :۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ ریاکاری نہ ہو تو انسان شائد ایک لمحے کے لئے بھی زندہ نہ رہ سکے۔ اب تم اپنی ہی مثال لو۔ ہم نے ایک دوسرے کو کیا دیا ؟

رجو :۔ سب کچھ دینے پر بھی کچھ نہ دیا فیروز۔

فیروز :۔ اور ہم دونوں دنیا کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنی زندگی سونپ دی ہے اور یہ بے وقوف دُنیا والے ہمیں خوش نصیب جوڑا کہتے ہیں۔
آئڈیل کپل ! ہاہاہا ! وٹ ہیپو کرسی ! ہیل ہپو کرسی !

رجو :۔ میں نہ کہتی تھی ؟

فیروز :۔ ہاں رجو۔ یہ اسی ریاکاری کا صدقہ ہے کہ ہم اس سوسائٹی میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ورنہ ہم کیا کچھ نہیں۔ کوئی جانے تو ۔۔۔ خیر ہٹاؤ اس بات کو رجو۔ یہ بتاؤ کہ کیا ہم واقعی چند لمحوں کے لئے دوستوں کی طرح رہ سکتے ہیں ؟

رجو :۔ کیوں نہیں رہ سکتے فیروز

فیروز :۔ ویری گڈ ! تو رجو۔ یہ تو بتاؤ کہ تمہیں ان چند لمحوں تک رجھانے کے لئے میں تمہارے لئے کون تحفہ دوں؟

رجو :۔ مجھے تحفوں کی ضرورت نہیں ہے فیروز۔

فیروز :۔ نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہوگا۔ برسوں کے بعد ہم ایک بار پھر دوستوں کی طرح ملے ہیں۔ تو پھر تحفہ کے بغیر کیسے چلے گا سلسلہ۔

رجو :۔ پلیز فیروز۔ ڈونٹ بی سو فورمل !

فیروز :۔ نہیں رجو۔ نہیں چلے گا۔ اچھا میں سفید گلاب کا یہ پھول تمہارے جوڑے میں لگاتا ہوں۔ یا تم کہو۔ تو ابھی گاڑی دوڑا کر تمہاری اس سبز ریشمی ساری کے لئے کوئی خوبصورت سنہرے رنگ کا پن لے آؤں۔ یا اگر اس میں وقت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے تو ایسا کرو کہ اپنے ہونٹ میری طرف بڑھا دو !

رجو :۔ فیروز !

فیروز :۔ ہاں رجو۔ میں تمہیں اپنی باہوں میں لے کر ایک بار پھر تمہارے ہونٹوں کا آب حیات پینا چاہتا ہوں اور یہ بھول جانا چاہتا ہوں کہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ تمہارے بچوں کا باپ۔ میں صرف یہ یاد کرنا چاہتا ہوں۔ کہ تم رجو ہو۔ پندرہ سال پہلے کی رجو۔ شوخ، چنچل۔ بھولی بھالی رجو۔ بولو۔ چُپ کیوں ہوگئیں ؟

رجو :- (الف، جی چاہتا ہے۔ کہ تمہاری ان باتوں کے لئے تمہارا مُنہ چوم لوں۔ تم سے جی بھر کر پیار کر لوں۔ آخری بار تمہاری باہنوں میں سمٹ کر اپنی جان دے دوں۔ اسی احساس کے ساتھ مر جاؤں۔ کہ میں نے مرتے مرتے تم سے بڑے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ پیار کیا تھا۔ تب میری رُوح بے قرار نہ رہے گی۔ اور شانت ہو کر کسی اَن دیکھے اُجالے یا کسی اَن بُوجھے اندھیرے غار میں کھو جائے گی۔ کاش! کاش! نہیں رجو! پاؤں روک لے اپنے۔ پاگل نہ بن (ب)، ہٹاؤ فیروز تم تو مجھے رُلانے لگے۔ یہ باتیں اب ہمیں زیب نہیں دیتیں!

فیروز :- پھر کیا ہو گا۔ پھر کیا ہو گا رجو؟ پھر ہم ایک دوسرے کے ساتھ یہ پہاڑ سا دن کیسے کاٹ سکیں گے۔؟

(الف)، فیروز! اپنے جذبات کو قابو میں رکھ لو۔ تم ان بالوں میں گلاب کا پھول نہیں لگا سکتے۔ کہ یہ کئی ہاتھوں سے کھیلتے آئے ہیں۔ تم اس ساری میں پن بھی نہیں لگا سکتے۔ کہ یہ ساری تمہاری اپنی خریدی ہوئی نہیں ہے۔ تم ان ہونٹوں کا آبِ حیات بھی نہیں پی سکتے۔ کہ ان پر اب بھی کئی ہونٹوں کے نشان باقی ہیں۔ ہمت کھو بو فیروز۔ رجو تمہاری بیوی ہے۔ تمہاری محبوبہ نہیں۔ محبوبہ کی لغزشیں معاف کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ایک بیوی کی لغزشیں معاف نہیں کی جا سکتیں۔ رجو تمہاری بیوی ہے۔ تمہاری محبوبہ رجو تو کب کا مر گئی۔ (ب)،

پھر کیا کریں رجو؟ تم ہی کوئی راہ سمجھا دو۔

رجو :- آؤ ریڈیو گرام پر رقص کی دھنیں بجائیں۔

فیروز :- (خوش ہو کر) اور رقص کریں۔ اے میری ہم رقص مجھ کو تھام لے (زور سے ہنستا ہے)، ہا ہا ہا! (پھر رُک کر)، لیکن رجو۔ لیکن۔

رجو :- لیکن کیا؟ (الف) سوچتا ہو گا کہ رقص میں رجو کے جسم کے ساتھ جسم ٹکرانا ہو گا۔ شانوں پر اُس کی زلفوں کو بکھرانا ہو گا۔ چہرے پر اس کی سانسوں کو سہنا ہو گا۔ اور پھر مارے دہشت کے سر موڑ کر کیلنڈر میں آج کی تاریخ دیکھنا ہو گی۔ (ب)، ہاں ہاں لیکن کیا؟ پلیز فیروز! لیٹ می!

فیروز :- آل رائٹ رجو! آل رائٹ۔ چلو یہ گُر بھی آزماتے ہیں۔

رجو :- تھینک یو فیروز۔ کون سا ریکارڈ لگاؤں پہلے؟

فیروز :- کوئی ہلکا پھلکا والٹز لگاؤ رجو۔

رجو :- کیوں کوئی فاسٹ ردم والا ریکارڈ نہ لگائیں؟

فیروز :- جیسی تمہاری مرضی

رجو :- اچھا ہٹاؤ۔ تم کہتے ہو تو یہ والٹز ہی لگاتی ہوں پہلے۔ لیکن دُوسرا ریکارڈ وہی فاسٹ ردم والا رکھو رہی ہوں۔ ہوں؟

فیروز:۔ ٹھیک ہے

[موسیقی ۔
ایک والہانہ ہلکا پھلکا ۔ گمبھیر ساز
پیش منظر میں ۔ چند لمحے ــــ
پھر پس منظر میں جائے ۔ اور]

رجو:۔ فیروز ۔

فیروز:۔ ہوں

رجو:۔ اب کیا سوچ رہے ہو ؟

فیروز:۔ کچھ نہیں ۔

رجو:۔ یہ ٹھیک ہے ۔ تم زیادہ سوچتے ہو ۔ تو غلط باتیں کرتے ہو ۔

فیروز:۔ (ہنس کر) یہ تمہارا خیال ہے ؟

رجو:۔ ہاں ۔

فیروز:۔ اچھا چلو یوں ہی سہی ۔ مگر اب تم سوچنے لگیں ۔

رجو:۔ ہاں ۔

فیروز:۔ مجھے سوچنے سے منع کیا جاتا ہے ۔ اور آپ سوچوں میں گم ۔

رجو:۔ میں سوچ رہی تھی فیروز ۔

فیروز:۔ کیا ؟

رجو:۔ کیا ہم اپنی زندگی نئے سرے سے شروع نہیں کر سکتے ؟

فیروز:۔ کئی بار آزما کر دیکھا ۔ لیکن نتیجہ معلوم

رجو:۔ ایک بار پھر سہی فیروز ۔ اپنے لئے نہ سہی محض بچوں کے لئے ۔ کیا ہرج ہے ؟

فیروز:۔ ہرج تو خیر نہیں ہے ۔ لیکن فائدہ بھی نہیں ہوگا ۔

رجو:۔ (اداس) فیروز !

فیروز:۔ ہاں رجو ۔ ہم اپنی اپنی ڈگر پر بہت آگے بڑھ چکے ہیں ۔ لوٹ کے آنا ممکن نہ ہوگا ۔ زندگی کی اس منزل پر آ کر ہماری حالت دو تھکے ہارے ۔ ٹوٹے بدنوں اور شکست ذہنوں والے ان راہیوں کی سی ہو گئی ہے جو غلط سمت میں چل تو پڑے ۔ لیکن اپنی غلطی جان کر بھی واپس نہیں لوٹ سکے ۔

رجو :۔ کیوں نہیں فیروزہ۔ آخر کیوں نہیں ؟

فیروزہ :۔ راہبوں میں لوٹ آنے کا حوصلہ ہے نہ طاقت

رجو :۔ تم تو ہر بات کو فلسفہ بناتے ہو۔

فیروزہ :۔ ہماری زندگی اسی فلسفے سے عبادت ہے رجو۔

رجو :۔ فیروزہ

فیروزہ :۔ ہُوں

رجو :۔ تو کیا کوئی اُمید نہیں ؟

فیروزہ :۔ ہُوں ہُنہ !

رجو :۔ کوئی راہ نہیں ؟

فیروزہ :۔ نہیں

رجو :۔ (چیخکر، پھر یہ دکھ دا کیوں ؟ یہ رقص کس لئے ؟ فیروزہ بند کرو۔ اس ریڈیو گرام کو! میرا دم گھُٹ رہا ہے۔ بند کر دو اسے۔ بند کرو۔ میں نہیں سُن سکتی! نہیں سُن سکتی!

فیروزہ :۔ ارے کمال ہے ذرا سی بات پر اتنی بدحواسی ؟ (ہنس کر) چلی گئیں ؟ (زور سے قہقہہ لگاتا ہے) (قہقہے کے دوران فاسٹ ردم والا ریکارڈ اپنے آپ بج اٹھتا ہے اور فیروزہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگائے جا رہا ہے)

فیروزہ ناچو! خوب ناچو! اپنی ساری تاریکیوں کو ساتھ لے کر ناچو۔ ہاہاہا! (الف) تمہارے قدم ناچ رہے ہیں۔ تمہارا وجود ناچ رہا ہے۔ تم اپنی تباہی پر ناچ رہے ہو۔ تم خود ہی اپنی زندگی کو تباہ کرنے کے لئے تانڈو ناچ رہے ہو۔ لیکن اس سے پہلے کہ تمہاری زندگی ختم ہو جائے۔ یہ تو سوچ لو کہ تم بھی آخر کیا ہو ؟ ایک ریاکار شوہر۔ ایک مکار باپ۔ ایک ڈھونگی انسان۔ پھر یہ یک طرفہ فیصلہ کرنے کا حق تمہیں کس نے دیا ہے ؟ تم نے کیونکر یہ فرض کر لیا ہے کہ زیادتی تمہارے ساتھ ہوئی اور تم نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ بھول گئے۔ آوارہ گردی کے دن۔ وہ آوارہ گردی کی راتیں ؟ ہاں ہاں وہی دن اور وہی راتیں۔ جب پاکدامن رجو تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے پہروں تمہاری منتظر رہا کرتی تھی۔ تب کہاں گیا تھا تمہارے اخلاق کا احساس ؟ غیرت کی رگ کہاں دب کر رہ گئی تھی تب ؟ (ب) نہیں بھولا۔ کچھ بھی نہیں بھولا۔ سب کچھ یاد ہے۔ لیکن میری آوارہ گردی اور رجو کے بھٹکنے میں کوئی تو فرق ہونا چاہیئے تھا ؟ میں مرد ہوں مرد۔ اور رجو ایک عورت ہے عورت۔ میں لاکھ بھٹکوں۔ پھر بھی مرد ہوں لیکن عورت ایک بار بھی بھٹکے تو۔

رجو :- تو عورت نہیں رہتی ۔ بلکہ سماج کا ناسور بن جاتی ہے ۔ یہی نا ؟

فیروز :- (چونکر) رجو ! تم میری باتیں سن رہی تھیں ؟

رجو :- ہاں سن رہی تھی ۔

فیروز :- لیکن یہ تو سراسر اخلاق اور آداب کے خلاف ہے ؟

رجو :- میں جانتی ہوں فیروز ۔ تم سے بہتر جانتی ہوں ۔ لیکن جو عورت تمہارے ان آداب اور اخلاق کی شکار ہو چکی ہو ۔ وہ ان آداب اور اخلاق کی کہاں تک پرواہ کرتی پھرے ؟

فیروز :- رجو ۔ تمہیں اسی طرح میری تنہائی میں مخل ہونے کا کوئی حق نہیں تھا ۔

رجو :- مجھے اپنے کلب کے یہ آداب مت سکھاؤ فیروز

فیروز :- میں کلب کی نہیں ۔ گھر کی بات کر رہا ہوں رجو ۔

رجو :- لیکن یہ تعلیم یہ آداب تمہیں اسی کلب میں سکھائے گئے ۔ جہاں ایک رات تم مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے تھے اور جہاں ......

فیروز :- رجو !

رجو :- جانتی ہوں کہ تم میں سچ سننے کی ہمت نہیں ۔ تم بزدل ہو فیروز ۔ بزدل !

فیروز :- رجو ! (تھپیڑ مارتا ہے) چپ رہو !

رجو :- (چیخکر) آہ !

فیروز :- بے لگام عورت ! بدتمیز ! جاہل ! (الف) اوہ یہ میں نے کیا کیا ؟ رجو کے منہ پر تھپیڑ مارا ؟ اوہ نو ! مائی گاڈ ! اتنی ذلت ! اتنی پستی ! ایک عورت پر ہاتھ اٹھایا میں نے ؟ لعنت ہے ! ہزار لعنت ہے مجھ پر میری اوقات پر !

رجو :- (سسکتے ہوئے) منہ کیا دیکھ رہے ہو ؟

فیروز :- آئی ایم سوری رجو ! آئی ایم سوری !!

رجو :- (نفرت سے) ہُنہ !

فیروز :- رجو مجھے معاف کر دو ۔ میں بہت شرمندہ ہوں ، واقعی بہت شرمندہ ہوں ۔ تم چاہو تو مجھے کوئی بھی سزا دے سکتی ہو ۔ میں اُف نہ کروں گا ۔

رجو :- (روتے ہوئے) فیروز ۔ تم نے میرے منہ پر تھپیڑ مارا ؟ اوہ میرے خدا (الف) فیروز ! تم نے بہت اچھا کیا بہت اچھا کیا ۔ اس سے یہ تو ثابت ہوا کہ تم اب بھی مجھ پر اپنا حق سمجھتے ہو ۔ شکریہ فیروز شکریہ ! (ب) سزا ؟

لگے پھر وہی آداب کی باتیں کرنے ؟

فیروز :- نہیں رجو ۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت پر یوں ہاتھ اُٹھایا ہے ۔ جانے مجھے کیا ہو گیا رجو ۔ اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دو ۔!

رجو :- (الف) ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا (ب) ، ہاتھ چلاتے وقت یہ نہ سوچا تھا ۔ کہ یہ ہاتھ ایک عورت پر ، ایک بیوی پر اور ایک ماں پر اُٹھ رہا ہے ۔؟

فیروز :- تم نے بزدل کہا ۔ تو میں آپے سے باہر ہو گیا ۔ ورنہ

رجو :- (الف) ایک تھپڑ اور جھڑ دو فیروز ! خدا کے لئے ایک تھپڑ اور جھڑ دو ۔ مجھے تمہارے پیار میں وہ مزا نہیں ملا ۔ جو مزا اس تھپڑ سے ملا (ب) ، ورنہ کیا ؟ میں اب بھی کہتی ہوں کہ تم بزدل ہو ۔ تُم میں سچ سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں !

فیروز :- تم کس سچ کی بات کر رہی ہو رجو ؟

رجو :- میں اس سچ کی بات کر رہی ہوں ۔ جو ہماری زندگی پر اپنے منحوس سائے ڈالے بیٹھا ہے ۔ سنو فیروز ۔ تم سچ مچ کاؤرڈ ہو سچ کا سامنا نہیں کر سکتے ۔ لیکن مجھے دیکھو میں ایک کمزور عورت ہوں ۔ بڑی ہی کمزور عورت ۔ لیکن مجھ میں سچ کا سامنا کرنے کا حوصلہ ہے

فیروز :- میں جانتا ہوں رجو ۔ کہ پہلی غلطی مجھ سے ہی سرزد ہو گئی تھی ۔ لیکن یہ کیا ضروری تھا کہ تم اس کے بعد ٹھوکر پہ ٹھوکر کھاتی پھرو ؟

رجو :- کشتی کو منجدھار میں ڈال کر کشتی سے یہ اُمید کہاں کی جا سکتی ہے کہ وہ ساحل کی طرف واپس لوٹے ۔ فیروز ۔ کشتی کو منجدھار میں ڈولنا ہی پڑتا ہے اور آخر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ منجدھار اسے لے ڈوبتا ہے ۔

فیروز :- بعض کشتیاں منجدھار سے نکل بھی آتی ہیں رجو ۔

رجو :- ناخدا کی ہمت اور حوصلہ سے ۔ اور تم میں وہ ہمت اور حوصلہ تھا ہی نہیں ۔ تم ساحل پر کھڑے تماشہ دیکھتے رہے ۔ میں ڈولتی رہی ۔ ڈولتی رہی ۔ اور شاید ڈوب بھی چکی ہوں ۔ اگر ایک سہارا نہ ہوتا : بچوں کا

فیروز :- ہاں بچے نہ ہوتے تو میں بھی اس پاکھنڈ میں دم توڑ چکا ہوتا ۔ وہ نہ ہوتے تو میں تمہارے ساتھ اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ اور وضعداری کو نبھا نہ سکتا ۔ کب کا مر کھپ گیا ہوتا !

رجو :- (چیخکر) فیروز ۔ ایسا نہ کہو فیروز ۔ تمہیں اپنے بچوں کے لئے زندہ رہنا ہو گا

فیروز :- اور تم رجو ؟

رجو :- (الف) میرا کیا ہے ؟ رہوں نہ رہوں ایک ہی بات ہے (ب) رہی تمہاری بات فیروز ۔ زندگی ہے

کے قابل ہے نہ مرنے کے۔ بس وہی درمیانی کیفیت ہے۔

فیروز:۔ شکر ہے۔ تم میری ایک بات پر ایمان تو لے آئیں۔

رجو:۔ میں سوچا کرتی تھی تم حد سے زیادہ کتابیں پڑھتے ہو اور وہیں سے یہ الم غلم باتیں سیکھتے ہو لیکن تمہاری یہ بات تمہارے ذاتی تجربے کی پیداوار ہے اور تمہارا ذاتی تجربہ میرا بھی تجربہ بھی بن چکا ہے

فیروز:۔ (الف) رجو آج اتنی گمبھیر ہے۔ حیرت ہے! یہ وہی رجو ہے نا؟ جو بات بات پر مجھے فلسفے کا طعنہ دیا کرتی تھی۔ ہاں ہاں یہ وہی بدھو چڑچڑی اور بد دماغ رجو تو ہے۔ لیکن نہیں۔ وہ رجو اتنی گمبھیر تو نہ تھی؟ اتنی Pathetic تو نہ تھی۔ (ب) خیر ہٹاؤ ان باتوں۔ یہ بتاؤ تم نے مجھے معاف کر دیا نا؟

رجو:۔ (الف) میں کب کی تمہیں معاف کر چکی ہوں۔ دل و جان سے معاف کر چکی ہوں فیروز۔ (ب ہنسکر) فیروز بھول جاؤ اس حادثے کو۔ ایک ایک کافی ہو جائے۔ کیوں؟

فیروز:۔ کافی؟ بھئی رجو۔ آج تو تم کو را حد تک اچھی چکنی دے رہی ہو۔

رجو:۔ شکریہ فیروز۔ تم نے بڑی فیاضی سے یہ Compliment دیا ہے۔

(ریڈیو گرام پر موسیقی کی دھن تیز ہو کر
بند ہو جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی)

فیروز:۔ (الف) پندرہ سال! ایک عمر ہوتی ہے ایک صدی گذرتی ہے اور میں نے کبھی بھی ایمانداری کے ساتھ مفاہمت اور دوستی کی فضا بنائے رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں اپنے وجود میں سمٹ کر آ گیا۔ ایک المیہ کردار بن گیا۔ یہ المیہ دیوتاؤں کے فرمان اور خداؤں کی مرضی کے مطابق ظہور میں نہیں آیا۔ خود میری تخلیق تھا۔ میں خود ہی اس ٹریجڈی کا مصنف ہوں۔ اوہ کاش! میں اتنا خود بین نہ ہوتا! اتنا خود غرض نہ ہوتا۔ تو تمہاری یہ زندگی، ہمارا یہ گھر خوشیوں سے معمور ہوتا! ایک جنت جس میں آدم اور حوا کے ساتھ ان کے پیار کی جیتی جاگتی نشانیاں تتلیوں کی طرح کلی کلی کونپل کونپل گھوما کرتیں! اوہ گاڈ! میں نے اپنی اس جنت کو خود ہی ایک دوزخ میں تبدیل کر دیا ہے! اور میرا دل، میرا ذہن، میرا وجود تک اس دوزخ کی آگ میں جھلس رہا ہے!

(ٹیلی فون کی گھنٹی)

(ب چونک کر) ہاں ــــ وہ ٹیلی فون۔! ہیلو!

آواز:۔ مسٹر فیروز گھر پر ہیں؟

فیروز:۔ ہاں ہیں۔ آپ ذرا ہولڈ آن کیجئے۔ بلاتا ہوں (پکار کر) رجو!

رجو :۔ (دور سے) کیا ہے ؟

فیروز :۔ تمہارا فون ہے۔

رجو :۔ کون ہے ؟

فیروز :۔ آ کر پوچھ لو کون صاحب ہیں

رجو :۔ اچھا آتی ہوں۔

فیروز :۔ ٹھہریئے۔ وہ آرہی ہیں۔ یہ لو رجو !

رجو :۔ یس

آواز :۔ اے رجو !

رجو :۔ اے سلمان !

آواز :۔ بھئی حد کر دی تم نے رجو۔ ہم سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور تم ہو کہ میاں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔

رجو :۔ نہیں یہ بات نہیں ہے ایک ضروری کام کی وجہ سے رک گئی۔

آواز :۔ واہ۔ پکنک سے بھی کوئی ضروری کام ہو سکتا ہے ؟

رجو :۔ ہاں بہت ہی ضروری سلمان۔ آئی ایم سوری۔ میں نہیں آسکوں گی۔ پروگرام کینسل !

آواز :۔ ارے واہ۔ تم کے کہہ دیا۔ اور پروگرام کینسل ہو چکا ؟

رجو :۔ میں آج گھر سے باہر نہیں جا سکتی۔ آج میری شادی کی سالگرہ ہے۔

آواز :۔ او ونڈرفل رجو۔ مبارک ہو۔ لیکن تم نے بتایا ہی نہیں ؟

رجو :۔ کسی کو نہیں بتایا۔ حضور مجھے آج صبح تک یاد بھی نہ تھا۔ اچھا بائے بائے !

آواز :۔ ٹھہرو ٹھہرو رجو۔ ایک درخواست ہے۔

رجو :۔ بولو۔

آواز :۔ کیا ہم سالگرہ کی پارٹی میں شامل نہیں ہو سکتے ؟

رجو :۔ اوہ۔ نو۔ پلیز ڈونٹ ڈسٹرب اس ٹو ٹو ڈے !

آواز :۔ اوکے رجو۔ وِش یو مینی ہیپی رٹرنز آف دی ڈے !

رجو :۔ تھینک یو سلمان ! (اطمینان کا سانس لے کر) اُف ! مسخرا کہیں کا !

فیروز :۔ اچھا بھلا پروگرام کھٹنگ کر دیا تم نے۔ چلی گئی ہوتیں۔

رجو :۔ بس تنگ آچکی ہوں۔ ان پروگراموں سے۔ وہی جانے پہچانے لوگ۔ وہی گھسی پٹی باتیں۔ وہی بے ہودہ مذاق

وہی بکواس اور پاکھنڈ۔ کوئی کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے ان چیزوں کا؟

فیروز:۔ ہاں آخر کہاں تک۔ اب مجھے ہی دیکھو نا۔ گھوم پھر کر پھر وہی کتابوں کی دُنیا میں پلٹ آیا۔

رجو:۔ (ہنس کر) اور میں شاید یہ کبھی نہ کر پاؤں گی! (چونک کر) ارے دودھ اُبل رہا ہوگا!

فیروز:۔ دوڑ کے جاؤ رجو۔ دُودھ اُبلتا ہے۔ تو کناروں سے باہر آ کر آگ میں جل جاتا ہے۔

رجو:۔ بالکل ہمارے ناپختہ اور کچے جذبات کی طرح (ہنسکر) ہاہاہا!

(ہنسی دُور جاتی ہے)

فیروز:۔ (الف) ناپختہ اور کچے جذبات! ہاں ذرا سی آنچ سے اُبل پڑتے ہیں یہ جذبات۔ اور بھنگ ہو جاتے ہیں۔ انسان تب ہوش میں آتا ہے۔ جب اس کے وجود میں ایک خلاء پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔ ایک تاریک، سرد۔ اور یخ بستہ غار۔ جس پہ جذبات کے سُورج کی ایک کرن بھی نہیں پڑتی۔ جانے یہ سُورج اور غار کی بات بار بار میرے ذہن میں کیوں اُبھر رہی ہے آج؟

رجو:۔ پھر ڈوب گئے سوچوں میں؟

فیروز:۔ (چونک کر) رجو۔ تم آگئیں؟

رجو:۔ کافی لو۔

فیروز:۔ تھینک یو رجو! کوفی

رجو:۔ کیا؟

فیروز:۔ کافی اور کیا؟

رجو:۔ او!

فیروز:۔ (کافی سِپ کرتے ہوئے) رجو ایک بات بتاؤ۔

رجو:۔ کہو۔

فیروز:۔ تُم نے مجھے معاف کیا نا؟

رجو:۔ (ہنس کر) کِس بات کے لئے؟

فیروز:۔ وہ رجو میں نے تھپڑ جڑ دیا۔ تمہارے مُنہ پہ۔

رجو:۔ بھول جاؤ فیروز۔ کافی پی لو۔ (الف) اس آدمی کا ضمیر اب تک زندہ ہے۔ مرا نہیں۔ اور یہ بڑی بات ہے۔ کاش! میں نے اِسے موقع دیا ہوتا۔ سمجھنے کا۔ سمجھانے کا۔ کاش! میں آج ہی کی طرح ہمت کر کے اس کے سامنے بیٹھی ہوتی۔ اس کی ڈانٹ سُنتی۔ اس سے پٹتی تو شاید دوستی اور مفاہمت کی راہ نکل بھی

آئی ہوتی۔

فیروز :۔ کیا سوچ رہی ہو۔؟

رجو :۔ میری آنکھ پھڑک رہی ہے۔

فیروز :۔ کیا تو وہم ہے۔

رجو :۔ نہیں فیروز۔ آج کچھ ہونے والا ہے۔

فیروز :۔ کیا ؟

رجو :۔ میں نہیں جانتی لیکن کچھ ضرور ہونے والا ہے۔

فیروز :۔ کافی پی لو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

رجو :۔ اور اگر کچھ ہو گیا تو ؟

فیروز :۔ تو دیکھا جائے گا۔ ابھی سے پریشان ہونا کیا معنی رکھتا ہے (الف) رجو ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ آج میرا دل بھی کچھ محسوس کر رہا ہے۔ ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ ارے۔ میرا دل تو زور سے دھڑکنے لگا ہے۔ اے میرے دل کی دھڑکنو! تم ہی بتاؤ کیا ہونے والا ہے ؟ تم اب سے بہت سال پہلے ایک انہیں کئی بار ایسے ہی دھڑک اٹھی تھیں۔ ہاں ان دنوں جب رجو سے میری ملاقات ہوئی تھی اور اسی رات تو تم نے کمال ہی کر دیا تھا جب رجو دلہن بن کر میرے گھر میں آئی تھی۔ تو دو سال تک میرا ساتھ دیتی رہی اور اس کے بعد تم نے ساتھ چھوڑ دیا۔ دل بجھ گیا تھا نا ؟ دھڑکنیں کہاں تک ساتھ نبھاتیں ؟ لیکن ــ لیکن آج یہ کیا ہو رہا ہے میرے دل کی دھڑکنو!

رجو :۔ فیروز۔ کافی پی لو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

فیروز :۔ ارے ہاں۔ میں تو بھول ہی گیا تھا اسے۔ لو ایک ہی گھونٹ میں ختم کئے دیتا ہوں اسے (پی کر) یہ لو ختم ہے کافی۔

رجو :۔ لیکن یہ ایک دم کھڑے کیوں ہو گئے ؟

فیروز :۔ وہ یاد آیا رجو۔ وہ جو میں ایک نیا رسالہ لے آیا تھا۔ شاید بچیاں اٹھا کر لے گئی ہیں۔ وہی دیکھنے جاتا ہوں۔

رجو :۔ (ہنس کر) بھلکڑ کہیں کے۔ بچیاں آج چار دن سے گل مرگ میں ہیں۔

فیروز :۔ ارے ہاں۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ پھر گیا کہاں وہ میگزین ؟ ہوں اب سمجھا۔ تم نے ہی اسے پکچر بک سمجھ کر بچوں کے کمرے میں رکھ دیا ہوگا۔ ہے نا ؟

رجو :- شائد لیکن مجھے یاد نہیں ۔

فیروز :- میں دیکھتا ہوں ابھی ۔

رجو :- (الف) میگزین میں ایسی کیا بات ہے جو فیروز کو بیٹھے بٹھائے اس کی یاد آگئی ؟ ہوگا کچھ ۔ لیکن اسے یوں اٹھکر نہیں جانا چاہیئے تھا ۔ شائد کوئی صورت نکل آتی ۔ باتوں باتوں میں کوئی بات سوجھ جاتی ۔ اور ہم ایک بار پھر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ۔ خیر ۔ اب بھی کچھ گیا نہیں ۔ اب بھی موقع ہے ۔ (ب) مل گیا میگزین ؟ ارے تمہارا چہرہ یوں سنکا ہوا کیوں ہے ؟ فیروز کیا ہو گیا تمہیں ؟ بولتے کیوں نہیں ؟

فیروز :- رجو ۔ تم نے بڑا ظلم کیا میرے ساتھ ۔ بہت بڑا ظلم ۔

رجو :- فیروز !

فیروز :- ہاں رجو ۔ تم نے منی کو ڈرائینگ کے چکر میں ڈال دیا نا ؟ میرا منہ چڑانے کے لئے ۔

رجو :- تو برا کیا کیا ؟ وہ تو ڈرائینگ میں سب سے آگے ہے ۔

فیروز :- برا ہوا اس کی ڈرائینگ کا (ہنسکر) برا ہو اس کی ڈرائینگ کا ! وہ تو ایک اچھی خاصی کارٹونسٹ بن گئی ہے ! ہاہاہا ! کارٹونسٹ ! منی کارٹونسٹ !!

رجو :- میں سمجھی نہیں فیروز ؟

فیروز :- یہ دیکھو اپنی لاڈلی منی کی کرتوت ! اور خوش ہو جاؤ !

رجو :- کیا کہہ رہے ہو فیروز ؟

فیروز :- دیکھو دیکھو کیا کارٹون بنا دیا ہے ۔ ہاہاہا ۔ گھر کا نقشہ کھینچ دیا ؟ یہ دیکھو ۔ یہ تم ہو ۔ اور یہ میں ہوں اور یہ منی ہے ۔ اور یہ بنٹی ۔ تم غصے میں تنی ہوئی ہو ۔ اور میں کتاب میں گم ۔ تمہاری پیٹھ میری طرف ہے اور میری پیٹھ تمہاری طرف ۔ منی بنٹی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے حیران لگا ہوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی ہے ۔ ذرا caption تو پڑھ لو کارٹون کا ۔ ہوم سویٹ ہوم ! (وحشت ناک قہقہہ) ہاہاہاہا !

رجو :- ہوم ۔ سویٹ ہوم ! (چینخکر) نہیں نہیں ! فیروز نہیں !

(چائے دانی الٹ کر ٹوٹتی ہے ۔)

نہیں نہیں ! میرے خدا ! ہماری زندگی کے منحوس سائے ہمارے بچوں کی زندگی پر پڑنے لگے ہیں ! فیروز ! انہیں بچاؤ ! خدا کے لئے فیروز ۔ انہیں بچاؤ !

فیروز :- (بہت ہی اداس ہوکر) گھر پیارا گھر (رندھے گلے سے) منی ! میری بچی ! مجھے معاف کردو منی ! میں تمہارا گناہگار ہوں ۔ مجھے بخش دو منی !

رجو :- (رندھے گلے سے) منّی ۔ مائے ڈارلنگ! خدا کے لئے اپنی گناہگار ماں کو صرف ایک بار معاف کر دو! صرف ایک بار (پھُوٹ پڑتی ہے) میرے خُدا! یہ میں نے کیا کیا!

فیروز :- (الف) اوہ گاڈ! یہ کیا ہو گیا؟ اب میں کون سا منہ دکھاؤں گا منّی اور بنٹی کو۔ اُن کی آنکھوں میں کیسے دیکھ سکوں گا۔ وہاں میرے لئے ملامت اور نفرت کے سوا اور کیا ملے گا؟ نہیں نہیں (اب چلّا کر) نہیں!

رجو :- (ڈر کر) فیروز!

فیروز :- (اسی طرح وحشت سے) رجو! مجھے روشنی مل گئی! میرا سُورج مجھے مل گیا۔ رجو!

رجو :- میں سمجھی نہیں فیروز؟

فیروز :- دیکھو رجو۔ ہماری بچیاں دو ننھے ننھے چراغوں کی طرح ہیں نا؟

رجو :- ہاں جن کی لو ٹمٹماتی ہے فیروز۔

فیروز :- آؤ رجو۔ ہم ان چراغوں کو سُورج میں بدل دیں۔

رجو :- فیروز!

فیروز :- ہاں رجو۔ ان کی روشنی سے اپنی زندگی کے تاریک سایوں کو اپنے وجود سے دُور کریں گے! رجو! اپنا ہاتھ بڑھا دو! اور وعدہ کرو۔ کہ تم میرا ساتھ دو گی!

رجو :- فیروز! میں (پھُوٹ پڑتی ہے) اوہ فیروز!

فیروز :- ارے روو نہیں رجو۔ خوش ہو جاؤ۔ آج ہم برسوں کے بعد پھر دو دوستوں کی طرح ملے ہیں۔ اٹھو جلدی کرو۔

رجو :- کہاں؟

فیروز :- ہم ابھی گُل مرگ چلیں گے۔ اور منّی کے لئے بہت سے مکسچر، برش اور ڈرائینگ پیپر لے جائیں گے۔ اٹھو۔ اٹھو! اب تو دیر نہ لگاؤ! وہ ہمیں ایک ساتھ دیکھیں گے تو شائد ہمارے بارے میں اپنی رائے بدل دیں!

رجو :- میں تیّار ہوں!

فیروز :- آؤ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو!

(موسیقی۔ طربیہ اور اس کے بعد فیڈ آؤٹ)

رجو:۔ شائد۔ لیکن مجھے یاد نہیں۔

فیروز:۔ میں دیکھتا ہوں ابھی۔

رجو:۔ (الف) میگزین میں ایسی کیا بات ہے جو فیروز کو بیٹھے بٹھائے اس کی یاد آگئی؟ ہوگا کچھ۔ لیکن اسے یوں اٹھکر نہیں جانا چاہیئے تھا۔ شائد کوئی صورت نکل آتی۔ باتوں باتوں میں کوئی بات سوجھ جاتی۔ اور ہم ایک بار پھر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے۔ خیر۔ اب بھی کچھ گیا نہیں۔ اب بھی موقع ہے۔ (ب) مل گیا میگزین؟ ارے تمہارا چہرہ یوں سنکا ہوا کیوں ہے؟ فیروز کیا ہوگیا تمہیں؟ بولتے کیوں نہیں؟

فیروز:۔ رجو۔ تم نے بڑا ظلم کیا میرے ساتھ۔ بہت بڑا ظلم۔

رجو:۔ فیروز!

فیروز:۔ ہاں رجو۔ تم نے منّی کو ڈرائینگ کے چکر میں ڈال دیا تا؟ میرا منہ چڑانے کے لئے۔

رجو:۔ تو برا کیا کیا؟ وہ تو ڈرائینگ میں سب سے آگے ہے۔

فیروز:۔ برا ہو اس کی ڈرائینگ کا (ہنسکر) برا ہو اس کی ڈرائینگ کا! وہ تو ایک اچھی خاصی کارٹونسٹ بن گئی ہے! ہاہاہا! کارٹونسٹ! منّی کارٹونسٹ!!

رجو:۔ میں سمجھی نہیں فیروز؟

فیروز:۔ یہ دیکھو اپنی لاڈلی منّی کی کرتوت! اور خوش ہو جاؤ!

رجو:۔ کیا کہہ رہے ہو فیروز؟

فیروز:۔ دیکھو دیکھو کیا کارٹون بنا دیا ہے۔ ہاہاہا۔ گھر کا نقشہ کھینچ دیا؟ یہ دیکھو۔ یہ تم ہو۔ اور یہ میں ہوں اور یہ منّی ہے۔ اور یہ بنٹی۔ تم غصّے میں تنی ہوئی ہو۔ اور میں کتاب میں گم۔ تمہاری پیٹھ میری طرف ہے اور میری پیٹھ تمہاری طرف۔ منّی بنٹی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے حیران لگا ہوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی ہے۔ ذرا caption تو پڑھ لو کارٹون کا۔ ہوم سویٹ ہوم! (وحشت ناک قہقہہ) ہاہاہاہا!

رجو:۔ ہوم۔ سویٹ ہوم! (چیخکر) نہیں نہیں! فیروز نہیں!

(چائے دانی الٹ کر ٹوٹتی ہے۔)

نہیں نہیں! میرے خدا! ہماری زندگی کے منحوس سائے ہمارے بچوں کی زندگی پر پڑنے لگے ہیں! فیروز! انہیں بچاؤ! خدا کے لئے فیروز۔ انہیں بچاؤ!

فیروز:۔ (بہت ہی اداس ہوکر) گھر بیار گھر (روندھے گلے سے) منّی! میری بچی! مجھے معاف کر دو منّی! میں تمہارا گناہگار ہوں۔ مجھے بخش دو منّی!

رجو :- (رندھے گلے سے) منّی ۔مائی ڈارلنگ! خدا کے لئے اپنی گناہگار ماں کو صرف ایک بار معاف کر دو! صرف ایک بار (پھُوٹ پڑتی ہے) میرے خُدا! یہ میں نے کیا کیا!

فیروز :- (الف) اوہ گاڈ! یہ کیا ہو گیا؟ اب میں کون سا منہ دکھاؤں گا منّی اور بنٹی کو۔ اُن کی آنکھوں میں کیسے دیکھ سکوں گا۔ وہاں میرے لئے ملامت اور نفرت کے سوا اور کیا ملے گا؟ نہیں نہیں (اب چلا کر) نہیں!

رجو :- (ڈر کر) فیروز!

فیروز :- (اسی طرح وحشت سے) رجو! مجھے روشنی مل گئی! میرا سُورج مجھے مل گیا۔ رجو!

رجو :- میں سمجھی نہیں فیروز؟

فیروز :- دیکھو رجو۔ ہماری بچیاں دو ننھے ننھے چراغوں کی طرح ہیں نا؟

رجو :- ہاں جن کی لو ٹمٹماتی ہے فیروز۔

فیروز :- آؤ رجو۔ ہم ان چراغوں کو سُورج میں بدل دیں۔

رجو :- فیروز!

فیروز :- ہاں رجو۔ ان کی روشنی سے اپنی زندگی کے تاریک سایوں کو اپنے وجود سے دُور کریں گے! رجو! اپنا ہاتھ بڑھا دو! اور وعدہ کرو۔ کہ تم میرا ساتھ دو گی!

رجو :- فیروز! میں (پھُوٹ پڑتی ہے) اوہ فیروز!

فیروز :- ارے روتی ہیں رجو۔ خوش ہو جاؤ۔ آج ہم برسوں کے بعد پھر دو دوستوں کی طرح ملے ہیں۔ اٹھو جلدی کرو۔

رجو :- کہاں؟

فیروز :- ہم ابھی گل مرگ چلیں گے۔ اور منّی کے لئے بہت سے مکسچر، برشز اور ڈرائینگ پیپر لے جائیں گے۔ اٹھو۔ اٹھو! اب تو دیر نہ لگاؤ! وہ ہمیں ایک ساتھ دیکھیں گے تو شاید ہمارے بارے میں اپنی رائے بدل دیں!

رجو :- میں تیار ہُوں!

فیروز :- آؤ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو!

(موسیقی۔ طربیہ اور اس کے بعد فیڈ آؤٹ)

غزلیں

رسا جاودانی

۲ دو غزلیں

میرے نیاز کا صلہ تیری ادائے ناز ہو
سجدہ تجھے کیا کروں میری یہی نماز ہو

ہو تو نقاب کے بغیر سامنے میرے جلوہ گر
پردہ تمہیں نہیں مگر پھر بھی نظر میں راز ہو

میں نے کہا تھا ہو کہیں قصۂ ہجر مختصر
عشق نے دی دعا مجھے عمر تیری دراز ہو

ساحلِ مدعا سے دُور ہے یہ سفینہ قوم کا
موجِ نفاق اُمڈ پڑی غرق نہ یہ جہاز ہو

کعبۂ حق کو اے رسا کیا ہے صنم سے واسطہ؟
جس کو خدا کا گھر کہیں۔ جلوہ گہ مجاز ہو!!

✻

وہ بام پر جو صبح و مسا جلوہ گر رہے
پھر کیا نظر میں عظمتِ شمس و قمر رہے

گر آج وہ نہ آئے تو کل آئیں گے ضرور
دیتے فریب دل کو یہ ہم عمر بھر رہے

دامن بچا کے ہم سے وہ سیدھے نکل گئے
ہم اُن کو دیکھتے ہی سرِ رہگذر رہے

پست و بلند سے ہے حسیں زندگی کی راہ
کیا لُطف سیر کا ہے جو یکساں سفر رہے

تیری بھی ایک راہ نہیں۔ اب کدھر چلا؟
ہم تیرے اِتباع سے اے راہبر رہے

بھیجوں تو اُس کو خط مگر ایسا نہ ہو رسا
بنکر رقیب اپنا کہیں نامہ بر رہے

شہ زور کاشمیری

غزل

ہم نے طریقِ عشق میں، رازو نیاز کی
جو بات کی، بصیغۂ اشراق وراز کی

اے اعتبارِ وعدۂ جاناں کے سوزِ خام
تُو نے مرے گداز کی ساعت دراز کی

کونین چومتے ہیں مری خاکِ پا کو آج
غائت کہیں یہی نہ ہو میری نماز کی

دیتا ہے دہر میرے جنونِ نیاز کو
تہمت تری نوازشِ دیوانہ ساز کی

برقِ جمال یہ نگۂ سرمگیں تری
اٹھتی سی موجِ کیف ہے طغیانِ ناز کی

میری نظر کی طورِ حقیقت کو ہے تلاش
الجھی کہاں یہ اوٹ میں برقِ مجاز کی

ہے طولِ انبساط کا ہر لمحہ جاں گداز
پھر دل کو جستجو ہے غمِ جاں نواز کی

اے مدعیٔ عشق تیانِ سحر طراز . ق . یہ تو نے کیا شکائتِ شامِ دراز کی

ہے تابشِ جمال کا ہر لمحۂ خیال
قیمت دل و دماغ کی عمرِ گداز کی

تخریب، کائناتِ دلِ زار کی مری
حامل ہے ایک اشارۂ کونین ساز کی

شہ زور طورِ دل پہ بعنوانِ بیخودی
یہ کس نے عرضِ حسرتِ راز و نیاز کی

قیصر قلندر

غزل

دلوں کے زخم سلگتے رہے جفاؤں سے
یہ وہ چراغ ہیں بجھتے نہیں ہواؤں سے

تمہارے شہر میں ملتا ہے یہ وفا کا صلہ
دکھوں کے گھاؤ لگے ہم کو آستانوں سے

عروسِ شب تیری زلفوں میں چاندنی گم ہے
بہک رہے ہیں قدم پھر سیہ گھٹاؤں سے

کچھ اس طرح سے سلگتا ہے اس صنم کا بدن
برس رہے ہوں شرارے خنک خلاؤں سے

رواں تھا آپ خموشی مجھے نہ تھا معلوم
پڑیں گے درد کے پتھر حسیں فضاؤں سے

ہمارے درد نے پہنا ہے رنگ و بو کا لباس
مہک غموں کی بھی آتی ہے خوش قباؤں سے

بجا کہ نبضِ زمانہ پہ ہاتھ ہے قیصر
میں ڈر رہا ہوں مگر وقت کے خداؤں سے

عرشؔ صہبائی

غزل

نہ مل سکے گا اسے کچھ بھی راہ گیروں سے
عبث زمانہ الجھتا ہے ہم فقیروں سے

مجھے بھی قابلِ بے داد جانیے صاحب
اگر ہو شکوہ کوئی حُسن کے اسیروں سے

وفا۔ خلوص۔ محبّت۔ نیاز۔ درد۔ الم
بھرا ہُوا ہے یہ دل ان گنت ذخیروں سے

لبوں پہ یونہی بکھیرو ذرا خفیف سی ہنسی
کہ زندگی ہے تبسّم کی اِن لکیروں میں

جو زندگی ہے تو پھر مشکلیں بھی لازم ہیں
کہ گردِ راہ لپٹتی ہے راہ گیروں سے

نہ دے سکیں گے تجھے کچھ بھی اہلِ دیر و حرم
پناہ مانگ مگر مے کدے کے پیروں سے

عجیب دَور ہے کم فہم اور ناداں لوگ
وفا سی چیز کو بھی تولتے ہیں ہیروں سے

حیات جہدِ مسلسل سے ہے عبادت عرشؔ
نہ مطمئن ہو بہت ہاتھ کی لکیروں سے

طیب شاہ صدیقی ضیغم

دو غزلیں

اک نگاہِ ناز سے دل کو شہیدِ ناز کر — حُسنِ نظر نواز کو اور بھی دلنواز کر
میری بساط ہے ہی کیا دشنۂ تیز مت اُٹھا — ابروئے بے نیاز کو تیغِ کرشمہ ساز کر
یا تو فراق میں مجھے لذّتِ جانگداز دے — یا تو شرابِ وصل سے مجھکو بھی سرفراز کر
ہستیٔ نامراد سے تنگ جنونِ شوق کو — مستیٔ جاودانہ سے سوزِ دروں کا ساز کر
بست و کشادِ دہر سے طبعتِ جنوں کو کیا غرض — عقدۂ عشقِ یار کو ناخنِ جاں سے باز کر
افسرِ شائیگاں اگر ہو نہ نصیب میں مرے — سنگِ فراز پہ مری نقشِ وفا طراز کر
نغمۂ نوبہار سے دل کی کشاد اگر نہ ہو — میرے سرودِ راز کو نغمۂ نے نواز کر
وقت نہیں گلہ کا یہ بند زباں ہو اسطرح — ضیغمِ جاں نثار کو مائلِ سوز و ساز کر

فرازِ عرشِ بریں میرا آشیانہ تھا — مکاں سے برتر و بالا مرا ٹھکانا تھا
کسی کے فیض سے رتبہ بلند تھا اتنا — جبیں چرخ تھی اور میرا آستانہ تھا
فرشتے نام مرا کرتے حرزِ بازو تھے — کسی کے تیر کا جب دل مرا نشانہ تھا
فضائے قدس میں مسجود تھا فرشتوں کا — قفس کا لیک مقدر میں آب و دانہ تھا

کشاں کشاں مجھے لایا جہاں ہیں حضرتِ عشق
صمیمِ دل سے مرا منتظر زمانہ تھا

دکھائے رنگ ہزار دو وصال و ہجراں نے
سمندِ عزم کو کافی یہ تازیانہ تھا

فنا کا جام پیا جب تبھی کھلی آنکھیں
بقائے لم یزلی حاصلِ زمانہ تھا

ملی نہ راہ اسے تھا ہجوم ارماں کا
یہ آہ کیا تھا مرے دل کا اک فسانہ تھا

نگاہِ قہر کی گرمی کی تاب شبنم کو
کہاں ہو مہر و وفا لب پہ اک ترانہ تھا

نہ وہ دماغ نہ دل حس پہ ناز تھا مجھکو
غزل میں لیک اثر از مئے شبانہ تھا

شوریدہ کاشمیری

دو غزلیں

جلوہ گر ہو گئے وہ اُس آن سے — ہاتھ دھو بیٹھے ہزاروں جان سے
ہم غریبوں کا ہو کوئی کس لئے — وہ بسر اپنی کریں گے شان سے
اس قدر بھی ہم سے وہ مائل نہیں — جسقدر انسان ہے انسان سے
ہر فسانہ اپنی ہی روداد ہے — میں لکھوں افسانے کس عنوان سے
خود ہے اپنے درپئے آزار دل — ہو مدارا کیونکر اس نادان سے
نظم ہوتے ہیں تخیل ہی کے ہاتف — ڈھل کے آتے ہیں گہر وجدان سے

زندگی شوریدہ صد طوفان ہے
دل ترا گزرا ہے اک طوفان سے

اس قدر بیداد اے صیاد کیوں — پر شکستوں کو کیا آزاد کیوں
خونفشاں ہیں سینہ چاکانِ چمن — نغمہ زن ہو بلبلِ ناشاد کیوں
ہار مانی سخت جانی نے کہاں ؟ — مہرباں ہو وہ ستم ایجاد کیوں
اب بھی خالی جام ہے ہر تشنہ کام — مغبچو! میخانہ ہو آباد کیوں
خوفِ رسوائی ہے کیا صیاد کو ؟ — ہمصفیرو! منع ہے فریاد کیوں
برق وش لہرا پھر اے حسنِ ازل! — ہو یہ دنیا مائلِ الحاد کیوں
ترجمانِ عشق و حسن و حق ہے یہ — شاعری ہو کارِ بے بنیاد کیوں
دردِ دل رکھتا نہ ہو جو کم نصیب — دے مرے اشعار کی وہ داد کیوں

عاشقو! یہ دور ہے شوریدہ کا
ذکرِ قیس و وامق و فرہاد کیوں

نشاط کشتواڑی

غزل

جب کوئی جلوہ نما ہو تو غزل ہوتی ہے — سامنے ماہ لقا ہو تو غزل ہوتی ہے

موسمِ گُل ہو چمن ہو اور شاخِ گُل پہ — بُلبلِ نغمہ سرا ہو تو غزل ہوتی ہے

چشمۂ مہر و محبت دل میں جب پھوٹ پڑے — ایک طوفاں سا بپا ہو تو غزل ہوتی ہے

منظرِ دلکش ہو رقصاں ہو وہ طاؤسِ چمن — اور ساون کی گھٹا ہو تو غزل ہوتی ہے

روبرو اپنے کوئی رشکِ قمر ہو کہ نہ ہو — اک تصور ہی جما ہو تو غزل ہوتی ہے

زلفِ گیتی جو پریشاں ہو سنورنے کیلئے — سامنے عُقدہ کُشا ہو تو غزل ہوتی ہے

رُخِ جاناں پہ جو چھائی ہو وہ زلفوں کی گھٹا — چاند بادل میں چھپا ہو تو غزل ہوتی ہے

دلِ مضطر کسی مجبورِ ستم کا جب بھی — درد سے چیخ رہا ہو تو غزل ہوتی ہے

ہو کسی لمحہ سکوں قلبِ پریشاں کو نشاط!
اور خلوت کی فضا ہو تو غزل ہوتی ہے

غزل

منگورام وفا

خدا کرے کہ انہیں مجھ سے پیار ہو جائے
خزاں رسیدہ چمن پُر بہار ہو جائے

دیارِ حسن کا وہ تاجدار ہو جائے
جہانِ عشق میں میرا وقار ہو جائے

نیازِ عشق سے نظرِ کرم کریں اُس دم
میرے خلوص پہ جب اعتبار ہو جائے

دکھا دوں دنیا کو گر داغ ہائے سوزِ دروں
غرورِ حسن ترا شرمسار ہو جائے

میرے فسانے کی تاثیر دیکھ لے کوئی
سُنا دوں جس کو وہی اشکبار ہو جائے

نکالوں سوختہ دل سے اگر شرارۂ غم
یہ آسماں یہ زمیں شعلہ زار ہو جائے

رہے نہ باقی وفا اُن سے ایک بھی شکوہ
وہ دل فگار اگر ہمکنار ہو جائے

حکیم منظور

غزل

ہر چند غم بڑھے ہیں شبِ تار کی طرح
چاہا ہے ان کو پھر بھی ترے پیار کی طرح

ثابت قدم ہوں ان کی جفاؤں کے باوجود
راہِ وفا میں سایۂ دیوار کی طرح

جب سے ملی صبا کو ترے پیرہن کی بُو
مہکی ہوئی ہے نافۂ تاتار کی طرح

گذری ہے رات وصل کی گذرے ہی جیسے وقت
کاٹی ہے رات ہجر کی بیمار کی طرح

وہ کون ہیں جو تم سے وفا مانگتے رہے
ہم نے جفا بھی مانگی طلبگار کی طرح

منظور زندگی بڑی پُر پیچ و خم ہوئی
یوں کہیے زلفِ یار طرحدار کی طرح

وجے سمن سوسن

غزل

بجتا ہے دِل کا ساز، سمجھنے کی بات ہے
بچھڑے دلوں کا راز، سمجھنے کی بات ہے

کوئی کسک نہیں، تڑپ نہیں، ٹیس بھی نہیں
ہے درد کا آغاز، سمجھنے کی بات ہے

خوابیدہ سی نگاہیں، اٹھیں، اُٹھ کے جُھک گئیں
یعنی، اٹھاؤ ناز، سمجھنے کی بات ہے

روتے ہوئے گذر گئے، یادوں کے قافلے
یہ دُور کی آواز، سمجھنے کی بات ہے

اُٹھتے رہے بگولے سے، آنکھوں کے سامنے
تخیل کی پرواز، سمجھنے کی بات ہے

راہِ طلب میں دل و جگر جان دے چکے
لُٹنے کے یہ انداز، سمجھنے کی بات ہے

تارے فلک کے توڑ کے آنکھوں میں بھر لئے
اے عاشقِ جانباز، سمجھنے کی بات ہے

روداد دِل سُنی، ہنسے، ہنس کے رو دیئے
اُن سا کوئی ہمراز، سمجھنے کی بات ہے

کیونکہ مزار یار پہ ہوتا رہا نثار
سوسن زباں دراز، سمجھنے کی بات ہے

ایم یٰسین

دو غزلیں

(۱)

وہ حسن کا پیکر، راحت جاں گلشن میں کبھی جو آئے گا
اُس کے رخساروں کا جوبن پھولوں کو بھی شرمائے گا

ہم خار بداماں بیٹھے ہیں اس جیون کے دوراہے پر
ہم جیسے خار پرستوں سے یہ الجھے گا کیا پائے گا

یہ کس کو خبر تھی گلشن میں پھولوں کے سہانے پیکر کو
خود اپنے ہاتھوں سے مالی کانٹوں کا کفن پہنائے گا

اے عقل و خرد کے رکھوالو تم پتھر چن چن کے رکھ لو
گلشن کی فضا سے ظاہر ہے وحشی پھر لوٹ کے آئے گا

اس کنج قفس میں اک بلبل گلشن کی یاد میں روتا ہے
اس روتے بُلبل کا نغمہ کتنوں کا من بہلائے گا

تم اس وحشی کو محفل سے اُٹھنے کے لئے کہتا بھی نہیں
آداب سے خود ہی اکتا کر یہ محفل سے اُٹھ جائے گا

(۲)

کچھ ہم سے کہو، کچھ ہم سے سنو اس رشک چمن کے افسانے
پھُولوں کی زباں پر رہتے ہیں جس غنچہ دہن کے افسانے

وہ بھی ہیں جنہوں نے اشکوں سے تاریکیٔ شب دھونا چاہی
پر ہم نے لکھے ہیں خون جگر سے صبح وطن کے افسانے

سب پیر مغاں سے برہم ہیں، رندوں کی جبینوں پر خم ہیں
میخانے میں جب سے پھیلے ہیں مجھ تشنہ دہن کے افسانے

مانا کہ خفا ہو تُم ہم سے، پر ہم بھی تو واقف ہیں تُم سے
ہونٹوں کی ہنسی نے کہہ ڈالے ماتھے کی شکن کے افسانے

اے دیر و حرم کی دیوارو، راہوں میں اندھیرا رہنے دو
ہر موڑ پہ چھڑتے رہتے ہیں اک زہرہ بدن کے افسانے

کچھ دیر درِ شب پر رُک کر گلنار شفق رو لیتی ہے
جب شام مسافر کہتی ہے، ناہید وطن کے افسانے

دینا فائقہ رفیق

غزل

گھیرے ہوئے ہے اس طرح آشفتگی مجھے
مڑ مڑ کے تک رہی ہے مری بے کسی مجھے

وابستہ تیری ذات سے ہیں دل کی فرحتیں
بھائی گی کس طرح سے تری بے رخی مجھے

تیرے جمال ہی کی ہیں یہ جلوہ ریزیاں
آتی نظر ہے چار سُو جو روشنی مجھے

دُنیا کی کسی بات کی تو بات ہی نہیں
اپنی بھی اب رہی نہیں ہے آگہی مجھے

سر پر ستم کے کوہ بھی ٹوٹے تو اُف نہ کی
تڑپا کے رکھ گئی مگر تیری ہنسی مجھے

کہنے کو یوں تو ہر طرف پھرتے ہیں آدمی
سچ پوچھیے تو ملتا نہیں آدمی مجھے

اے دل صراطِ عشق میں رُک رُک کے یوں قدم؟
ڈر ہے ڈبو نہ دے تری فرزانگی مجھے

سمجھا ہی کب ہیں اپنی خوشی کو خوشی اے دوست
تیری خوشی میں ہی نظر آئی خوشی مجھے

رکھا خرد نے آج تک ناکام اے جنوں
کب کام آسکے گی تری دوستی مجھے

واغنا! یہ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے
مرعوب تجھ کو بندگی ہے مے کشی مجھے

ڈر ہے کہیں نہ عشق میں یہ حال ہو رفیق
میں زندگی کو یاد کروں زندگی مجھے

منظر اعظمی

غزل

نکہت و رنگ کی دُنیا کو بسائے ہوئے لوگ
کاش دیکھیں بھی کبھی خوں میں نہائے ہوئے لوگ

اک نگاہِ غلط انداز کے محتاج ہیں یہ
اپنے ارمانوں کو سینے سے لگائے ہوئے لوگ

جانے انجامِ ترقی ہے کہ فیضانِ خرد
یوں سلگتے رہے خود اپنے ہی ستائے ہوئے لوگ

زخم کوئی بھی ہو محتاج حنابندی ہے
آنچ دے اُٹھتے ہیں یہ زخم اٹھائے ہوئے لوگ

ہو نہ ہو شہرِ محبت سے ہی آتے ہوں گے
اپنے ٹوٹے ہوئے خوابوں کو سجائے ہوئے لوگ

پھر وہی دور کہ صنّاع ہیں سب خوار و زبوں
چوٹ خود اپنے ہی پیشے کی یہ کھائے ہوئے لوگ

ہم نے بھی عشق سے منظرؔ کرلی توبہ کی ہے
جب سے دیکھے ہیں محبت کے ستائے ہوئے لوگ

امر چند ولی

غزل

اگر حسن کی گل فشانی نہ ہوتی
کہیں عشق کی ترجمانی نہ ہوتی

یہ جلوے نہ ہوتے یہ غمزے نہ ہوتے
یہ فتنے نہ ہوتے جوانی نہ ہوتی

کسی رنج کش کو نہ دیتے جدائی
کسک دردِ دل کی تنہائی نہ ہوتی

ٹپک کر لہو داغ دل سے نہ رستا
اگر خونِ دل میں روانی نہ ہوتی

اگر نیم کش تیر دل سے نکلتا
خلشِ داغِ دل کی نشانی نہ ہوتی

جنوں کی وضبطِ جنوں کی کہانی
جنوں کی کہیں سرگرانی نہ ہوتی

جلائے دیئے ہجر کے جو نہ ہوتے
ولی ہجر کی شب سہانی نہ ہوتی

ودیا رتن عاصی

غزل

غلط سب دلیلیں غلط سب حوالے
اندھیرے اندھیرے اُجالے اُجالے

ہمیں جان و دل سے وہ اپنا بنالے
مگر ہم کہاں ایسی تقدیر والے

مجھے وعظ پر وعظ فرمانے والے
اگر کوئی تیری بھی نیندیں چُرالے

اگر میری ہستی کھٹکتی ہے تجھ کو
تو لے ڈوب جاتا ہوں اے ناخدا لے

حقیقت ہمیشہ حقیقت رہے گی
کوئی لاکھ پردے حقیقت پہ ڈالے

محبّت پہ تیرا یہ احساں رہے گا
محبّت میں جی سے گذر جانے والے

کوئی دم کے مہمان ہیں اے زندگی ہم
جہاں تک تجھے راس آتا ہے آلے

مقدّر کی نیرنگیاں توبہ توبہ
کہیں راتیں روشن کہیں دن بھی کالے

کسی جانِ جاں کی امانت ہیں عاصی
یہ اشکوں کے طوفاں یہ آہیں یہ نالے

غزل

مقبل کاشمیری

ماند ہو گئیں آنکھیں مگر وہ بے نقاب آتا نہیں
پاس میرے بزم میں جام شراب آتا نہیں
غمزہ ہو عشوہ ہو یا ناز ہو دلدار کا
در پئے آزار ہیں اُن کا جواب آتا نہیں
آ رہا ہے یہ سنا وقت نزع بالیں پہ وہ
روح اُڑنے کو ہے وہ بہر صواب آتا نہیں
تیری فرقت میں سدا گریاں و نالاں یوں رہا
آہ سوزاں اشک پیہم کا حساب آتا نہیں
دورِ ساقی جام کر ساقی غنیمت ہے شباب
یہ حقیقت ہے کہ دوبارہ شباب آتا نہیں
خواب تھا تیرا وہ جلوہ جو دکھایا ایک بار
مل رہا ہوں میں کف حسرت وہ خواب آتا نہیں
اے سراپا حسن ہیں تیرے گدا سارے حسین
بے حجاب تیرے مقابل آفتاب آتا نہیں
ہے چمن کا ذرہ ذرہ عشق سے مجروح یاں
زخم دلِ عریاں کیے تنہا گلاب آتا نہیں
یاس و حرماں پر ہوں مائل طرب و عیش مجھ پر حرام
میرے دل کی ظلمتوں میں آفتاب آتا نہیں
اشک پیہم آہ سوزاں دیکھیے ہیں مضطرب
بحر متلاطم میں اب اضطراب آتا نہیں
محفلِ عشاق میں مقبل کبھی آیا ہے مگر
سامنے وہ غمزدہ خانہ خراب آتا نہیں

برج موہن شفق

غزل

ہمیں اُن سے محبّت ہو گئی ہے
بڑی رنگیں طبیعت ہو گئی ہے

یہ دل کی بے قراری تو یہ تو یہ
محبّت اک مصیبت ہو گئی ہے

نہیں دُنیا سے کوئی اُنس ہم کو
کہ اُس کافر سے اُلفت ہو گئی ہے

غمِ جاناں میں جب سے مبتلا ہیں
غمِ دوراں سے فرصت ہو گئی ہے

مہک اُٹھے ہیں کانٹے بھی وہاں پر
جہاں تیری عنایت ہو گئی ہے

نہیں پہچان پائے اُس کو کوئی
شفق کی ایسی حالت ہو گئی ہے

زبیدہ سیمی

غزل

جن زلفوں میں دل اُلجھا تھا سنور گئی ہیں مجھکو ڈس کر
پھولوں سے جو پھول چُنا تھا مجھ کو چبھا وہ کانٹا بن کر
میں نے پیار کیا تھا اُن سے جن کو دُنیا نے ٹھکرایا
سوچ رہا ہوں چھوڑ گئے ہیں وہ بھی میرے دل کو مسلکر
جان چکا ہوں اس دُنیا کو پھر بھی پیار کئے جاتا ہوں
شاید اس دُنیا میں مجھ کو مل جائے تجھ ایسا آخر
جب تک بدل نہیں لیتا میں اس دنیا کے طور پرانے
ذکر نہ ہوگا عشق و محبت کی باتوں کا میرے لبوں پر
میں تو ہوں آوارہ شاعر میری ایک انوکھی فطرت
میں تو ہنستا ہی رہتا ہوں اس دُنیا کے رنج و الم پر

•

ایک شعر

سفینہ ڈوب کر اُبھرا، سہارا لے کے پھر ڈوبا
نہ جانے گفتگو کیا کچھ ہوئی موجوں سے ساحل کی

دو شعر

دُور بہت دُور افق سے بھی پرے　　ٹمٹماتا ہوا اک تارا نظر آتا ہے
جس طرح میری افسردہ امیدوں کا چراغ　　کبھی بجھتا ہے کبھی بجھ کے جل جاتا ہے

افسانے

آفاق احمد

سودا

"ہاں اَب تو وہ اُسی سے شادی کرے گا۔"

نغمہ کا دل ایک دم بیٹھ سا گیا۔ نہ جانے کتنی کوشش کے بعد اس نے اُبلتے ہوئے آنسوؤں کو روکا۔ اور ادب سے آداب کہہ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ اور پھر باتیں ہوتی رہیں... بہت سی باتیں — دنیا کے متعلق" گھر کے متعلق...... موسم کے متعلق...... اپنی منتظمانہ شان — باورچی خانہ کی خوشبوئیں...... رشتہ داریوں کے جھگڑے...... مگر نغمہ خاموش بیٹھی سب کچھ سنتے ہوئے بھی کچھ نہیں سن رہی تھی......

"بہن! بڑی خاموش ہے نغمہ بیٹی؟"

وہ اور سمٹ گئی۔ اداسی کی ایک اور سرد لہر نے اس کے اعصاب پر مسلّط خاموشی کو اور گہرا کر دیا۔

"میں تو تنگ آگئی ہوں اُس کی اس عادت سے — ہر وقت جیسے سانپ سونگھے رہتا ہے...!"

"اس میں تنگ آنے کی کوئی بات نہیں...... خاموشی تو اچھی عادت ہے...... اور خاص طور سے اس زمانہ میں جب شرم وحیا کا نام بھی کوئی نہیں جانتا...... جسے دیکھو ہوائی دیدہ نظر آتی ہے۔"

نغمہ کی آنکھیں کچھ اور بھیگ گئیں

"یہ تو ٹھیک ہے بہن... کل کو اسے پرائے گھر جانا ہے۔ اگر یونہی منہ میں گھنگنیاں ڈال کر وہاں بھی بیٹھی رہی تو آنے جانے والے یہی سمجھیں گے کہ لڑکی یا تو گونگی ہے.... یا توتلی....."

"اپنا اپنا خیال ہے...... میرا جاوید تو شرمیلی لڑکیوں کو بہت پسند کرتا ہے... ابھی کل کی ہی بات ہے.... جاؤ بیٹی تم آرام کرو......"

اور نغمہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ شکنجہ سے چھوٹ گئی ہے اور منوں بوجھ اس کے سر سے اُتر گیا ہے... مگر ایک بے نام خلش نے اسے پھر آن دبوچا۔ آخر کب تک؟..... آج پھر سودا ہوگا..... میں کس وقت سوتی ہوں، کس وقت اُٹھتی ہوں.... میرے منہ میں کتنے دانت ہیں..... میرے چہرے کا گلابی رنگ اور رخساروں

پر مسکراتا ہوا تل فطری ہے یا میک اپ کا مرہون منت ۔ ۔ ۔ ۔ ماں باپ کی حیثیت کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کتنے بھائی بہن ہیں۔ تعلیم کتنی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ناچ سکتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ گا سکتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ اور نہ جانے کیا کیا !!

یہ خدا جانے میری امّی کو کیا ہو گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دل و جان سے چاہنے والی امّی اب کیوں میری صورت سے بیزار ہو گئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ "بیٹی خاموشی اچھی عادت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دوسروں کے سامنے زیادہ بیٹھنے اور بے وجہ گفتگو سے احتراز کرنا چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔" اور جب میرا بچپن اُن کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنا کر اپنا کر ایک حقیقت بن چکا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ خاموشی میری فطرت بن چکی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تو وہ چڑ جاتی ہیں کہ میں اتنی خاموش کیوں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ میں خاموش کہاں ہوں۔ لوگ میرے سینے میں ابلتا ہوا لاوا کیوں نہیں دیکھتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ جانے کتنی ان کہی داستانیں میری آنکھوں میں تڑپ رہی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ نہ جانے کتنے گیت میری زندگی کے خاموش سے ساز کی مدّھم سی لے پر تڑپتے رہتے ہیں۔ آخر کیوں میری خاموشی کی زبان کیوں نہیں سمجھتا ۔ ۔ ۔ ۔

"آج مجھے میری خاموشیوں کا ہمراز مل گیا ۔ ۔ ۔ ۔" یہ ایک سرگوشی تھی جو اس کے دل نے سہیل کو ایک نظر دیکھتے ہی کی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بہت زیادہ حسین نہیں تھا۔ مگر اس کے معصوم چہرے پر ذہانت، متانت، اور بردباری کے ایسے نقوش تھے جو اس نے ایک نظر میں پڑھ لئے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ خود کچھ کھویا کھویا سا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کے دل کی خاموش راہوں سے پھر ایک سرگوشی اُبھری ۔ ۔ ۔ ۔

"یہی ہے میرے خوابوں کا رفیق ۔ ۔ ۔ ۔ جس کا ہاتھ تھام کر میں نے ان غیر مرئی فضاؤں کے بے شمار چکّر لگائے ہیں۔ جن کی کہانی میری خاموشی۔ جوانی کی گود میں بیٹھ کر اکثر سنایا کرتی ہے"

"امّی! ہم تو اپنی نغمہ باجی کی شادی سہیل بھائی سے کریں گے"۔ چھوٹی بہن نے شرارت اور معصومیت سے کہا ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کی خاموشی پر حیا کا ایک اور پردہ پڑ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر اس کے بعد اسی طرح کے بے شمار جملے اور اشارے اُس کی خلوتوں کو رنگین کرتے رہے،

سہیل سے وہ کئی بار ملی، مگر کبھی کسی قسم کی گفتگو سے اس کے لبوں کا کنوار پن نہیں ٹوٹا ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے دل میں کئی بار نغمگی کی لہریں اُبھریں۔ مگر نہ جانے کیوں ایک رنجانہ خوف اس کی زبان پکڑ لیتا تھا کہ اس کے لبوں کی پہلی جنبش سے اُن کے رشتہ کا تقدس ختم ہو جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ اور گفتگو کی ضرورت بھی کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ سہیل پہلی نظر میں ہی ایک، کھلی ہوئی کتاب، کی طرح اُس کے سامنے آ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ اگرچہ وہ بھی اس کے سامنے عام طور سے خاموش رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"وہ بہت ذہین ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے ضرور میری خاموش حکایتوں کو پڑھ لیا ہوگا جن کے خدوخال میری

میری ویران زندگی سنوارا کرتی ہے"

"مگر سُنا ہے سہیل شادی کر رہا ہے"...... امّی کے الفاظ اس کے کانوں میں پھر گونجے...... اُس کے آنسو اب نہ جانے کہاں سوگئے تھے۔ بس ایک دبی دبی سی دُکھن۔ اس کی کنپٹیوں میں جاگ رہی تھی...... وہ کیوں روئے...... آخر اس کا سہیل سے کیا رشتہ تھا...... وہ ہمیشہ اُس کے سامنے خاموش رہی......

وہ سمجھتا ہوگا کہ یہ موم کی بے حس لڑکی زندگی کی کڑی دھوپ میں اس کی ہمسفر کس طرح بن سکے گی......

اور شاہینہ...... اس کی ہم پیشہ ہے...... جفاکش ہے، اور اس میں خود کو پیش کرنے اور دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے، وہ خوابوں کی سرزمین سے دُور اس زمین، سخت زمین کے سینہ پہ جیتی ہے۔ اُسے اس کا انتظار نہیں کہ کوئی خوابوں کا شہزادہ آئے اور بغیر کچھ کہے اسے اپنے سنہری اڑن کھٹولہ میں بٹھا کر لے جائے...... آخر اس کا شاہینہ سے کیا مقابلہ...... اسے شاہینہ کی طرف جھک جانا چاہیئے تھا......

نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا...... یہاں کتنے آئے...... تقریبًا سب ہی اس کی نظر سے گذرے...... میرے وجود کا بوجھ امّی کو کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگا...... وہ کسی نہ کسی بہانے سے سب سے ملاتی رہیں۔ ان میں اچھے بھی تھے اور بُرے بھی۔ رشتہ دار بھی تھے اور پرائے بھی۔ مگر سب ایک جیسے تھے...... مگر وہ سب سے مختلف تھا...... اگر باقی سب لوگ اس کی خاموشیوں کے خانہ کی چوکھٹ تک نہیں پہنچ پائے تو اسے کبھی شکائت نہیں ہوئی...... مگر وہ بھی...... کیا وہ بھی اوروں کی طرح تھا...... نہیں اسے مختلف ہونا چاہیئے تھا......

"میرا جاوید تو شرمیلی لڑکیوں کو پسند کرتا ہے" اسے دیکھ کر تقریبًا ہر جاوید کی ماں نے یہی کہا۔ اور پھر کسی بہانے جاوید بھی آتے رہے۔ انہوں نے بیٹھ کر جو خودستائی کی داستان چھیڑی ہے۔ تو وہ نہ جانے کتنی بار سو سوگئی، سستے سستے اشعار پڑھکر وہ اس سے داد طلب کرتے رہے وہ بے دلی سے برداشت کرتی رہی...... انہوں نے اپنی ذہانت، امارت اور میک اپ کا بھونڈا مظاہرہ کیا۔ اس کے کان پہ جوں نہ رینگی...... اسے نہ جانے کیوں ایسی باتوں سے چڑ سی تھی...... اور پھر ایک کے بعد ایک اُسے "ڈل"۔ "بور" "بیوقوف" "خود پسند" "مغرور" اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر چلے گئے...... مگر اس نے دامن پر بیٹھ کر اڑ جانے والی مکھّی کی طرح کبھی اُن کا خیال نہ کیا......

مگر سہیل؟...... اُسے ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا...... کاش وہ سب سے مختلف ہوتا...... سہیل نے اس سے کبھی کوئی وعدہ نہیں کیا...... مگر پھر بھی اُسے اس سے شکائت تھی۔ ایک بے نام سی شکائت......

جبکہ اوروں نے اس کے حضور میں فرش سے عرش تک ہر شے لانے اور جنم جنم تک ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر ان کے منہ پھیر کر چلے جانے سے ایک انجانی خوشی سی ہوئی۔

"آخر یہ کیا رشتہ ہے؟......"

"تو پھر میں رشتہ کی بات پکی سمجھوں..."

شاید امی اور ان کی نئی مہمان اندر آ رہی تھیں........ وہ اٹھ کر برابر کے کمرے میں چلی گئی.....

"بہن! جلدی کیا ہے........ میں سوچ کر جواب دوں گی..." اور وہ تکیہ میں منہ چھپا کر سوچنے لگی...

آج پھر اس کا سودا ہو رہا ہے...... اب وہ گھر جا کر اس پر تبصرہ کریں گی ..... اس کے لباس، اس کی خاموشی اور اس کی ہر بات کا ذکر ہوگا...... گھر والے فقرے کسیں گے، جہاں یہ کسی لڑکے کی زندگی اور خوشی کا معاملہ ہے...... وہاں اس کی زندگی بھی داؤ پر لگی ہے۔ آخر وہ کیوں خاموش رہے...... کیوں؟ کس لئے؟ انہیں کیا حق ہے؟...... یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ وہ بے دام بک چکی ہے...... اس کی خاموش دنیا کا شہزادہ کب سے اپنا الہ دین کھٹولہ لئے منتظر ہے..... اور اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر دنیا سے کہہ دے......

"مجھے یہ سودا منظور نہیں ہے...... مجھے یہ سودا منظور نہیں ہے...." مگر اس کی آواز رندھے ہوئے گلے کی گہرائیوں میں ڈوب کر رہ گئی......

نور شاہ

جنّت

تم کہاں ہو؟ ذرا قریب آؤ کہ میں تمہاری آنکھوں پر انگلیاں رکھ سکوں اور تمہارے چہرے کو چھو سکوں۔ تمہاری گھنیری زلفوں کی سیاہ گھٹاؤں کی گود میں سر رکھ کر اپنی نیندوں میں کھو سکوں۔ تمہاری لانبی لانبی جھکی جھکی پلکوں کے سائے میں اپنے خوابوں کو بیدار کر سکوں۔

میں نے سوچا۔ یہاں کچھ بھی نہ ہوگا یہ کبھی نہ سوچا تھا۔ موت کی سی ویرانی ہے۔ ہر سمت دھول اُڑ رہی ہے ملبے کے ایک بڑے تودے سے اب بھی دھوئیں کے کثیف بادل اُٹھ اٹھ کر فضا میں بکھر رہے ہیں۔ کل تک اسی جگہ وہ چھوٹا سا خوشنما بنگلہ ملگجی دھوپ کی چھاؤں میں کھڑا میری روح کی تسکین کا باعث تھا اور اب یہاں جھلسی ہوئی اینٹوں اور پتھروں کا ایک عظیم انبار، ایک بیکراں سناٹے میں ڈوبا نظر آ رہا ہے ——— میری بے نور سی بجھی بجھی آنکھیں۔ مٹی اور راکھ کے انبار تلے جیسے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہیں قدم تھکے تھکے سے اُٹھ رہے ہیں۔ آس پاس کے سارے گھر ہوائی حملے کی نذر ہو چکے ہیں۔ لیکن اپنے گھر کے مدفن کے سوا مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ یہاں جلے ہوئے پھولوں کی بو سے میرے نتھنے پھڑ پھڑانے لگے ہیں۔ بالکل یہیں پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ اب یہاں کچھ بھی نہیں ——— کچھ بھی نہیں۔ ہاں! راکھ کا ایک بڑا ڈھیر سامنے نظر آ رہا ہے۔ راکھ کے اس بڑے ڈھیر کے نیچے کبھی وہ خوبصورت پورچ تھا جس کا رنگین فرش قوس و قزح کے سے رنگ بکھیرتا نظر آتا تھا۔ ہاں اُدھر ڈرائنگ رُوم تھا۔ اب بیش قیمت صوفوں اور خوبصورت فرنیچر کی جگہ سیاہ کوئلوں کے بڑے بڑے دھبّے ڈراؤنی سی صورتیں پیش کر رہے ہیں۔ اور قرمزی رنگ کے ریشمی پردوں سے آراستہ وہ خواب گاہ، جہاں داخل ہوتے ہی بے اختیار مجھے نیند کی انگڑائیاں اپنی آغوش میں لینے کو لپکتی تھیں۔ صندل کی لکڑی کے بڑے جڑاؤ فریم میں یہاں مینٹل پیس کے ذرا اوپر نازش کی تصویر لٹکی ہوئی تھی!!

نازش جو اپنی تصویر کی طرح خود بھی کہیں دور چلی گئی ہے۔ مجھے چھوڑ کر۔ اس گھر کے ویران کھنڈروں کو چھوڑ کر کہیں دور ——— کیسے اور کن چاہتوں سے نازش نے خوابوں کی اس جنّت کو سجایا اور سنوارا تھا لیکن شاید

اُسے اپنی جنت سے ہی پیار تھا۔ اس کے ویران اور جھُلسے ہوئے کھنڈروں سے نہیں۔ جبھی تو وہ بھی چلی گئی۔ نازش جو چار سال پہلے دلہن بن کر میرے ویرانوں کو بہاروں میں بدلنے آئی تھی لیکن یہ جنت کتنی جلدی لُٹ گئی۔

میں سوچ رہا ہوں مجھے یاد آ رہے ہیں وہ دن، جب میں اور نازش ایک ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے ہم جماعت تھے، پھر دوست بن گئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اسی دوستی نے محبت کا روپ دھار لیا۔ محبت جس کے وجود کا میں قائل نہ تھا۔ محبت — میں سمجھتا تھا پہلی نظر کے دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن نازش سے ملتے ہی محبت کے بارے میں میرے سارے شکوک مٹ گئے۔ نازش کے رُوپ میں مجھے محبت کا مفہوم مل گیا تھا۔

میں نے نازش سے کہا تھا۔

"پیار کی قندیلیں جلا کر تُم نے میری تاریک راہوں میں زندگی کی روشنی بکھیر دی ہے" نازش نے کہا تھا۔

"محبت کی شمعیں جلتی ہیں اور جل کر ہی روشنی بکھیرتی ہیں"

"ہاں نازو — محبت کی یہ شمعیں اب ہمیشہ ہمیشہ جلتی رہیں گی۔ ہماری زندگی اسی روشنی سے تاباں رہے گی!"

"سچ — محبت ہی زندگی کی تفسیر ہے"۔ اس نے کہا تھا۔

"پیار زندگی کا سرمایہ ہے اور ہم دونوں مل کر اس سرمائے کو جیتے جی ایک امانت رکھیں گے۔"

محبت کا یہ جذبہ دبے پاؤں ہم دونوں کے دلوں میں جاگا تھا۔ یہ ان سُنی آواز ہم دونوں نے ایک ساتھ سُنی تھی اور ہم نے ساری زندگی ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ تعلیم ختم ہوئی نازش اپنے گھر چلی گئی۔ اور مجھے فوج میں کمیشن مل گیا۔ محبت کا پھول کھِلتا رہا۔ پروان چڑھتا رہا — اور ایک دن نازش دلہن بن کر آئی اور میں نے کہا۔

"میرے خوابوں کے جھروکے میں تمہارے سراپا کی جو تصویر بسی ہوئی ہے اس میں تُم حوروں کو بھی شرما رہی ہو۔ تمہارے چہرے کے تبسم میں میرے لئے سارے جہاں کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ اور تمہیں اپنے قریب، اتنے قریب پا کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ......؟!"

بس ایک خواب تھا جو ایک لمحہ میں فنا ہو گیا۔ ایک بار پھر میری پتھرائی ہوئی نظریں اپنی اس لُٹی ہوئی جنت کے اس گوشے کی طرف اُٹھ رہی ہیں۔ میں اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے کونوں اور اینٹوں کے اس بڑے ڈھیر کے قریب۔ یہاں کچھ بھی نہیں۔ راکھ اور مٹی ہے۔ ہاں! چند ٹوٹے ہوئے کھلونے بھی ہیں۔ میرے مٹی اور راکھ سے بھرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ نازش اور میرے پیار کا سنگم ٹوٹ چکا ہے۔ وہ کلی مسلی جا چکی ہے۔ وہ پھول مرجھا چکا ہے۔ میرا بیٹا، میری خوشیوں اور تمناؤں کا مرکز، میرے مستقبل کی تعبیر، مجھے دیکھے بغیر نہ جانے راکھ کے کس ڈھیر کے نیچے سو چکا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، پھر نہ دیکھنے کے لئے، پھر نہ ملنے کے لئے —!!

اُس شام میں نے سُنا کہ نازش اُمید سے ہے۔ وہ شام جیسے سارے جہان کی خوشیاں میرے لئے

سمیٹ کر لائی تھی۔ دوسرے دن میں رنگ برنگے کھلونے لئے گھر آیا۔ کتنے سارے کھلونے تھے! نازش حیران رہ گئی۔

"ارے یہ کیا؟" نازش نے کہا تھا۔

"کھلونے"

"کس کے لئے" نازش نے پوچھا۔

"منّی کے لئے" میں نے جواب دیا۔

"منّی کے لئے ۔۔۔ اوہ ابھی سے ۔۔۔؟" اور پھر دوسرے لمحے نازش کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ نازش کو شائید میرے بھولے پن پر بے اختیار پیار آگیا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے خواب گاہ میں لے آئی۔ اور میرے سینے پر اپنا سر رکھ کر ایسے دیکھنے لگی۔ جیسے میں صدیوں بعد ملا ہوں۔

"اونہہ! اچھا تم کیسے سمجھتے ہو لڑکی ہوگی؟" اس کے لہجے میں مصنوعی خفگی تھی

"میرا دل کہتا ہے ایک پیاری سی بیٹی ہوگی۔"

"میں کہتا ہوں کہ ایک پیارا سا بیٹا ہوگا۔"

"تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے نازو؟"

"میرے کہنے ہی سے سب کچھ ہوتا ہے۔"

"کیوں ۔۔۔"

"اس لئے کہ میں منّی کی ماں ہوں۔"

"اور میں منّے کا باپ ہوں۔"

"اچھا وقت آنے دو۔ دیکھنا کہ منّی کی ماں جیتتی ہے یا منّے کا باپ۔"

"پاپا۔"

اب کون مجھے پاپا کہہ کر پکارے گا۔ میں نے تو اُسے دیکھا تک نہیں۔ بس نازش کا خط ملا تھا دو ہی دن پہلے کی بات ہے۔ نازش نے لکھا تھا ۔۔۔

میرے اچھے ساتھی!

میں جیت گئی اور تم ہار گئے۔ لڑکا ہوا ہے بس بالکل تمہارے جیسا! ہاں تم کب آ رہے ہو؟ جلدی چلے آؤ۔ اپنے بیٹے کو دیکھ لو نا ۔۔۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُس کی معصوم آنکھیں تمہیں تلاش کر رہی ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ابھی سے تمہیں پاپا کہنے کے لئے معصوم سے کومل کومل ہونٹوں کو کھولنے کی کوشش کر رہا ہے ۔۔۔ تم کب آ رہے ہو!

تمہاری نازش

اور میں خوشی میں جھومتا یہ خط لے کر اپنے آفیسر کے پاس گیا تھا۔

"سر میں گھر جانا چاہتا ہوں"۔

"کیوں ــــ؟!"

"گھر سے خط آیا ہے۔ میں باپ بن گیا ہوں"۔

ایک لمحے کے لئے میرا آفیسر خاموش ہو گیا۔

"سر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سر میں چلا جاؤں" میں نے پوچھا۔

"میں جانتا ہوں تمہارا گھر جانا ضروری ہے لیکن ـــــ لیکن تم تو دیکھ رہے ہو کہ جنگ کے بادل چھا رہے ہیں معلوم نہیں اگلے لمحے کیا ہوگا، تم ہمارے اچھے آفیسر ہو"۔

مجھے محسوس ہوا جیسے اچانک قوس قزح کے ٹھنڈے پُرسکون رنگ خلط ملط ہو کر خون اور آگ کی لالی میں بدل گئے ہوں۔ جیسے دیکھتے دیکھتے پُرامن فضاؤں میں جنگ کے کثیف بادل اڑنے لگے ہوں۔ امن کے دیوتاؤں کو جنگ کے خونخوار دیوؤں نے للکارا ہو۔ تخریب نے تعمیر کو ڈھا دیا ہو۔ خون اور آگ کی ہولی شروع ہوئی ہو اور آدمی بے بس ہو کر آہوں اور کراہوں سے ہم کنار ہوا ہو ـــــ ہائے! میں نے سوچا امیدوں اور آشاؤں کے دن آنے والے تھے۔ اُمیدیں رنگ بکھیر رہی تھیں۔ امنگیں جنم لے کر مچل رہی تھیں۔ کھیتوں پر سنہری بالیاں لہرا رہی تھیں فصل پکنے کو تھی اور اسے کاٹ کر اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے سہانے سپنے دلوں کو گدگدا رہے تھے کہ سرحد کے اُس پار ایک آواز اُبھری ـــــ

جنگ ہو گی!! کون کس کے لئے لڑے گا۔ کون کس سے لڑے گا؟ میں نہیں جانتا ـــــ

میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بھی تو فوج میں اسی لئے بھرتی ہوا تھا کہ جنگ میں لڑوں گا۔ دشمن سے لڑوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دشمن!

میں نے سوچا۔

جنگ ہو گی، موت اور ویرانی کا سناٹا چھا جائے گا۔ کھیتوں کی سنہری بالیاں جھلس جائیں گی فصلیں تباہ ہوں گی۔ پھول جھلس جائیں گے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"کیا سوچ رہے ہو"۔

"سر۔ سوچ رہا ہوں آخر یہ لوگ جنگ کیوں چاہتے ہیں۔ کیوں لڑنا چاہتے ہیں؟"

"آفیسر خاموش رہا۔ مجھے اس کی خاموشی میں اپنی بات کا جواب مل گیا۔

دفعتاً بولا۔

"تم گھر جا سکتے ہو۔ میں نے تمہاری دو دن کی چھٹی منظور کر لی ہے ــ صرف دو دن کی چھٹی ....!"

اور اب یہ میرا گھر ہے!! کل تک یہاں زندگی تھی۔ زندگی کی رونق تھی اور آج یہاں کچھ بھی نہیں۔ کوئی زندگی نہیں۔ صرف دھواں ہی دھواں ہے۔ میری ساری باتیں، میری ساری یادیں، میرے سارے خیالات رنگ برنگے بلبلوں کی طرح دیکھتے دیکھتے پھٹ کر ہواؤں میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ میرے سارے درد، میرے سارے درد بھرے گیت ایک ساتھ جاگ پڑے ہیں!

میں چیخنا چاہتا ہوں۔ اتنی اونچی آواز میں چیخنا اور چلّانا چاہتا ہوں کہ اس ہولناک ویرانے کو سناٹے کا دل کانپ کر رہ جائے اور ان سنسان اور ویران راکھ کے تودوں اور جھلسے ہوئے کھنڈروں سے میری! اس چیخ کی ایسی بازگشت سُنائی دے رہی ہے۔

"پاپا ...... پاپا"

اب کون مجھے پاپا کہہ کر پکارے گا۔ میرا بیٹا بالکل مجھ جیسا! کون مجھ سے پریوں کی کہانیاں سُنے گا۔؟ شام کا اندھیرا پاؤں پھیلائے گا تو اندرِ خواب گاہ کی کھڑکی میں کون میرا انتظار کرے گا۔ کون میرے قدموں کی چاپ سننے کا منتظر ہو گا؟

چاندنی راتوں میں کون مجھ سے محبت بھری باتیں کرے گا؟

کوئی نہیں ــ کوئی نہیں ــ اب کوئی نازش دلہن بن کر نہ آئے گی۔ کوئی نازش میرا انتظار نہ کرے گی کوئی پھول نہ کھلے گا ــ بس اب دھواں پھیل جائے گا۔ ایک ایسا دھواں جو ساری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

میں جا رہا ہوں۔ اپنی نازش کو چھوڑ کر۔ نازش کی جنت کو چھوڑ کر۔ ذہن میں ایک طوفان لئے۔ دل میں ایک خلش لئے۔ ان سے لڑنے کے لئے جنہوں نے مجھ سے میری جنت چھین لی۔ میں جا رہا ہوں پیار اور محبت کی امانت لوٹنے والوں سے انتقام لینے ــــ

میں نے سوچا تھا۔ فوج حفاظت کے لئے ہوتی ہے۔ ایسی ہزاروں جنتوں کی حفاظت کے لئے نہ کہ ان جنتوں میں آگ لگانے کے لئے!! انہیں بموں سے مسمار کرنے کے لئے ...... میں جا رہا ہوں ..... دور .... بہت دور .... میں انسانیت کے دشمنوں سے لڑوں گا۔ انتقام لوں گا۔

ایک خبر

کیپٹن شاہد کی موت کی خبر پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ اب اس سلسلے میں تفصیل ملی ہے۔ کیپٹن شاہد

بہت بہادری سے لڑ رہے تھے کہ دشمن نے شہر کے بڑے نرسنگ ہوم پہ حملہ کرنے کی کوشش کی۔ شاہد نے بہت ہمت اور بہادری سے یہ حملہ ناکام بنا دیا اور اس طرح کتنے ہی معصوم بچّوں، بچیوں اور عورتوں کی جانیں بچا لیں! لیکن خود اپنی جان نہ بچا سکے ——!!!

رقیہ منظور الامین

اُس کی گلی میں

دیوی امبا کی یاترا تھی۔ میلا لگا ہوا تھا۔ وہی دیہات کے عام میلوں جیسا میلا۔ کسی نے چادر تان کر دوکان کھڑی کر لی تھی، تو کسی نے گھنے سائے دار درخت کا آسرا لے لیا تھا اور کچھ تو ایسے تھے جو تپتے سورج یا بکھرے بادلوں سے بے نیاز یونہی اپنا سرمایۂ حیات ٹین کے جھنجھنے، لکڑی کی چینیاں، مٹی کی ہنڈولیاں وغیرہ میلے سے چیتھڑے پہ ایک خوبصورت بے ترتیبی سے بکھیرے بیٹھے تھے۔ جیسے کسی محنت کش ہتھیلی کی بے ہنگم لکیریں ہوں۔ یہ ہاتھ کی لکیریں اور دیہاتی پگڈنڈیاں کبھی نہیں بدلتیں۔ یہ پگڈنڈیاں بڑی جاندار ہوتی ہیں — جاگتی بھی ہیں۔ سوتی بھی ہیں۔ کہانیاں بھی کہتی ہیں، بس کوئی سننے والا مل جائے۔ اس وقت یہ پگڈنڈیاں جاگی ہوئی تھیں۔ آس پڑوس کے سبھی گاؤں والے یاترا کی ہلچل میں حصہ لینے ان ہی کے سینوں پہ پاؤں دھرتے مندر کے باڑے کی طرف آ رہے تھے۔ یہ قدم اتنے جانے پہچانے تھے کہ پگڈنڈیاں "سی" تک نہیں کرتی تھیں۔ چکر والے جھولے 'چرچوں' 'چرچوں' کرتے گھومتے جاتے۔ کیا ہوا جو ان میں ٹنگے لکڑی کے گھوڑوں کے سر غائب تھے احساس بڑی چیز ہے۔ بیٹھنے والے تو یہی سمجھ رہے تھے جیسے خالص عربی نسل کے گھوڑے پہ بیٹھے ہوں۔ کچھ کی مینخیں تک یار لوگوں نے ہاتھ کی صفائی دکھا کر اکھیڑ لی تھیں کہ ہو سکتا ہے کبھی ان کی بیل گاڑی یا ہل کو اس کی ضرورت پڑ جائے۔ یہ مستقبل بھی اللہ نے خوب چیز بنائی ہے۔ انسان آنے والے 'کل' کے بھروسے "آج" کی سختیاں خاموشی سے جھیلے جاتا ہے۔ چلو اللہ میاں کا تو 'چت' بھی سیدھا اور 'پٹ' بھی سیدھا۔ خیر بات تو میلے کی چل رہی تھی۔ دن چڑھتے چڑھتے گرمی بھی زور پہ آ رہی تھی۔ کچھ من چلے کالی عینک لگائے گلے میں سرخ، سبز مفلر ڈالے، گوند کے پانی سے پیشانی پر بالوں کے پھگے جمائے گنے کا تازہ رس پی رہے تھے تو کچھ عورتیں ٹولیاں بنائے 'تو' 'تو' 'میں' 'میں' میں مصروف تھیں۔ اس بار کالج کے بھی کافی لڑکے یاترا دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ اجلی پتلونوں اور پالش زدہ جوتوں سے یہ نسل صاف پہچانی جاتی تھی۔

سادر کر دادا کے تربوزوں پر چوٹ تھی۔ یہ ہاتھی کے بچے ہاتھوں ہاتھ بک رہے تھے۔ لاکھی چوڑیوں

کی کھنک، چھنک سے سہاگنوں کے سہاگ، تازہ ہو رہے تھے۔ کہیں کہیں چندیاؤں پر نازک ہاتھوں کی کراری جوتیاں بھی پڑ رہی تھیں۔ وجہ اب کیا بتائیں! بہرحال ہر طرف زندگی کی نبض پھڑکتی صاف سُنائی دیتی تھی لیکن اس میلے کی جان تو دیو داسیاں تھیں۔ کسے ہوئے کاشٹے پاؤں میں چاندی کے توڑے، کلائیوں، کمر اور جوڑے میں پھولوں کے گجرے، دنبالے دار سرمگیں آنکھیں اور ان آنکھوں میں بے باکی۔ ستواں ناک کی دونوں جانب یہ آنکھیں جیسے ترازو کے دو پلڑے ہوں۔ یوں چٹکی بجائی۔ اور یوں گاہک سے مول تول ہو گیا اچھے بھلے گُڑ کی ریوڑیاں خریدتے انسان کو کہنی سے ٹھونس لگا دیں گی۔ بھلا مانس ہو تو۔ "کیا کرتی ہے مری" کہہ کے پرے ہٹ جائے گا اور جو کوئی ضرورت مند ہوا تو نام پتہ پوچھکر چلتا بنے گا۔ تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔"

مندر کی گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں اور لوگ اپنی ناکیں دیوی کے آگے گھسے جا رہے تھے اسی نیک ساعت میں جلال کی ملاقات لچھمی سے ہوئی۔ دراصل وہ ایک مارواڑی سے دھکا کھا کر پلٹی تو اچانک اسے جلال نظر آگیا۔ جو شہباز خان کی ہوٹل پر کھڑا ٹین کی کرسی پر ایک پاؤں جمائے بغیر کُنڈی والی کپ میں چائے پی رہا تھا۔ نعیم اسکی پاس والی کرسی پر بیٹھا سموسوں اور چائے کا بل چکا رہا تھا۔ لچھمی جلال کے پاس پہنچ گئی اور دھیرے سے کہا۔

"بابو چائے پلائے گا؟"

"چائے کی بچی بھاگ جا یہاں سے" — نعیم پلٹ کر غرایا۔

"ٹھہر جا یار —" جلال لچھمی پر ایک بھرپور نظر ڈالتا ہُوا بولا "غریب ایک کپ چائے پی لے گی تو کونسا غضب ہو جائے گا۔"

"تو پلاؤ تم اسے چائے۔ اگر کسی نے مجھے اس سے باتیں کرتے دیکھ لیا اور اماں تک بات پہنچی تو وہ رو تی روتی مر جائیں گی۔" نعیم کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

"بابو تو گُسہ ہوتا ہے —" لچھمی اٹھلا کر بولی، اور کٹھن سے ایک اٹھنی ٹیبل پر مارتی ہوئی بولی۔ "لو سا با ج کھوان تم ہی چائے دے دو۔"

"رکھ اپنی اٹھنی تھیلی میں" شہباز خان نے چائے کی پیالی تھماتے ہوئے کہا "جیسے آج پلا رہا ہوں تجھے چائے۔"

جلال اسے طشتری میں چائے ڈال کر پیتا ہوا دیکھتا رہا۔ سانولا رنگ، بہت ہی تیکھا ناک نقشہ موم بتی کے شعلہ سا تھرکتا بدن۔ سر کے اوپر ایک طرف کو کھسکا ہوا گھنے بالوں کا جوڑا اور اس میں بیلے کے

پھولوں کا گجرا۔ سجی ہوئی کلائیاں۔ چائے پی کر اس نے کپ، طشتری پر اوندھا دی۔ اور تھال میں دو کھنچے اٹھائے جانے کے لئے مڑی۔

" لوٹ کب رہی ہے"۔ شہباز خان نے ٹوکا۔

" بس سندھیا تک لوٹ جاؤں گی، نرسی وغیرہ کے ساتھ۔ دیوی کے چرن چھو لئے اور اب کام کیا ہے"۔ وہ جاتی ہوئی بولی۔

" ہاں، تیرا کام تو دہیں اچھا چلتا ہے۔ دیوی تو بس مانگتی ہے دیتی کچھ نہیں"۔ شہباز خان نے جملہ کسا۔

" ایسے نابو سایاج کہاں"۔۔۔ وہ جاتی ہوئی رک گئی۔" دیوی نے بہت نڑا جاہے۔ دیو داسیوں کی ساری بستی میں ہے کوئی میرے ٹکر کی۔ بڑی بات نہیں ہوں گی چار چار دن ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہیں"۔ اور پھر وہ بھیڑ میں شامل ہو گئی۔

" یہ کہاں کی دیو داسی ہے"۔۔۔ جلال نے شہباز خان سے پوچھا" ایسا لگتا ہے تم جانتے ہو۔

" لچھمی کو کون نہیں جانتا۔۔۔ اپنے شام گاؤں ہی کی تو ہے۔ داسی پورے میں رہتی ہے۔ بڑی ٹھسے والی ہے ماں۔ ایسوں ویسوں کو تو منہ نہیں لگاتی۔" شہباز خاں نے مونچھوں پر بل دیتے ہوئے کہا" یار خان کبھی کبھی ہو آتے ہیں گن کر پانچ روپیہ لیتی ہے"۔

" تم کیوں جاتے ہو اسکے یہاں"۔ نعیم نے بیوقوفی دکھائی۔

شہباز خاں نے زور کا قہقہہ لگایا" تمہارے منہ سے دودھ کی بو نہیں گئی ابھی نعیم میاں"۔

" مجھے لے چلوگے شہباز خاں، لچھمی کے پاس"۔ جلال نے للچا کر کہا۔

" لے تو چل سکتا ہوں"۔ شہباز خاں نے سر کھجا کر ٹوپی آنکھوں پر لاتے ہوئے کہا"۔ لیکن ابھی چکر میں ابھی مت پڑو میاں، پڑھ لکھ لو پہلے"۔

" وہ بھی دیکھا جائے گا"۔ جلال نے کہا۔" تو نہ ہی پکی بات"۔

" چلو، میرا کیا جاتا ہے"۔۔۔ شہباز خاں نے شانے چڑھاتے ہوئے کہا" پتہ چلنے پر گھر میں آپ درست کر دیئے جاؤگے"۔ پھر دونوں شہباز خاں کے چھپر سے نکل آئے۔

شہباز خاں کا مستقبل ہوٹل شام گاؤں کے کالج روڈ پر تھا۔ اس کے گاہکوں میں زیادہ تر کالج کے لڑکے ہی تھے۔ گو وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا۔ لیکن ایک مراٹھی ایک اردو روزنامہ پابندی سے اس کے پاس آتا۔ جنہیں وہ ان لونڈوں سے پڑھوا کر سنتا اور سیاست پر بڑی" دھواں" رائے زنی یہ کرتا۔

اس دوران کوئی اور گاہک آجاتا تو اسے اُٹھنا بھی پڑتا لیکن اب بڑھتی ہوئی گرانی کے پیش نظر وہ ایک منٹ کے لئے جاتا اور چائے کی کپ اور سموسے گاہک کے آگے پٹخ، دوڑے آتا اور اپنا تہمد سنبھال ٹین کی کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھ جاتا۔ اور غور سے سُننے لگتا۔ ایسے میں اس کی ٹوپی اپنے آپ آنکھوں تک آجاتی، مونچھیں ڈھل جاتیں اور مونچھوں تلے منہ لٹک جاتا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی خلا میں گھورتی اور کان کی لویں آگے کو مڑ جائیں۔ ہاتھ سے پاؤں مسل مسل کر میل کی بتیاں گراتے ہوئے وہ کبھی کبھی سر کو ایسے جھٹکا دیتا جیسے اب اسے دورہ پڑنے والا ہو۔ اس کی بس تین ہی دلچسپیاں تھیں سیاست اور تیسری دلچسپی تو آدم علیہ سلام ہر مرد کی گھٹی میں ڈال گئے ہیں۔ اس تیسری دلچسپی کی چار شاخیں تھیں۔ ایک دلچسپی تو اسے لڑکا دیکر اللہ کو پیاری ہوئی۔ دوسری دلچسپی طلاق پاکر گھر بیٹھ رہی۔ تیسری کو ہوٹل کے لئے سموسے اور چیوڑا بنانے سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اور دلچسپی کی چوتھی شاخ تھی لچھمی۔ ویسے ہی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے وہ لچھمی کے پاس کبھی کبھی چلا جاتا جو داسی پورہ ان ہی دیو داسیوں کی بستی تھی۔ صاف ستھری۔ لپے پُتے گھر جگہ جگہ گھروں کے سامنے تلسی کے پودے۔ کہیں کہیں چنبیلی کے منڈوے۔ ایک روز لچھمی نرسی کے ساتھ باہر بیٹھی ہوئی تھی کہ شہباز خاں جلال کو لیئے آ پہنچ گیا۔

"دیکھ، نیا یا لو آیا ہے" ــــ نرسی نے تنکا چباتے ہوئے کہا۔ اور اٹھکر چلی گئی۔

"آؤ سایاج کہاں، بابو، بڑی کرپا کی گریبوں پر ــــ چلو اندر چلو" وہ آگے آگے چلتی ہوئی بولی۔

یہ کمرہ درمیانی سائیز کا تھا۔ چھت کو بلو کی ہی لیکن اس پر چھت گیری لگی ہوئی۔ ایک کونے میں تپائی پر پیتل کی لٹیا میں کاغذ کے پھول لگے تھے جن پر افشاں چھڑکی ہوئی چم چم کررہی تھی۔ وہیں ایک خس کا دستی پنکھا دھرا تھا۔ دوسری طرف ایک صاف ستھرا چھپر کھٹ تھا جسے اور کاغذ کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ کمرے میں چندن کی خوشبو بسی تھی۔ شہباز خاں جلال کو لے کر چھپر کھٹ پر بیٹھ گیا اور لچھمی اُن کے لئے پان لگانے لگی۔ تھال میں چونا کتھا لگے کھلے پان اور کٹوریوں میں سپاری الائچی رکھکر اس نے پیش کیا۔ شہباز خان نے پان کلے میں دبایا اور کہا "میں تو اب جارہا ہوں۔ ان جلال میاں کا خیال رکھنے لگی۔

دو سال مچھلی کی طرح وقت کی دھارا میں پھسل گئے۔ اور جلال نے وکالت کی ڈگری لے لی۔ اور ساتھ ہی ماں باپ کے دل میں بہو لانے کا ارمان جاگا۔ لچھمی والی بات خانصاحب سے چھپی نہیں تھی۔ وہ اور ان کی بیگم جلال کی اس "ہیرا پھیری" سے واقف تھے۔ لیکن سوچا کہ چلو کیا ہوا لڑکا ہی تو ہے۔ بیوی آئے گی تو خود ہی سنبھل جائے گا۔ لیکن جب شادی کی بات جلال کے کانوں تک پہنچائی گئی تو اس نے فیل مچا دیا اور صاف صاف کہدیا کہ اب بھی لچھمی کو اپنی زندگی سے خارج نہیں کرسکتا۔ اور نہ کسی معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کرنا چاہتا ہے۔ جب کسی

طرح کام نہ چلا تو نعیم کی خدمات حاصل کی گئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ آج لچھمی کے ہاں جلال کے ساتھ نعیم بھی موجود تھا رات کے اندھیرے میں سب کی نظروں سے چھپکر۔

"آخر آگیا نا تو بھی اس کے چکر میں" ـــ جلال نے کہا "وہ ہے ہی ایسی چیز ـــ چل آج تجھے وہاں چھوڑ کر میں ٹل جاؤں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے" ـــ نعیم نے کہا۔

"اب چھوڑ یار ان شرافت کی قدروں کو اس کی چوکھٹ دم۔ واپس ہوتے ہوئے سمیٹ لینا" اور وہ اندر داخل ہو گئے۔

لچھمی انہیں دیکھتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کاشٹے کی لانگ نیچے اڑستے ہوئے چھپر کھٹ پہ سے بکھرے ہوئے کپڑے تہہ کر کے اٹھانے لگی۔

"یہ کیا آج تو نے کپڑوں کی دوکان لگا رکھی ہے" ـــ جلال نے بچھے ہوئے کپڑے چھپر کھٹ سے گرا دیے اور بیٹھ گیا۔

"بس وہی پرانی ہی تو دھوتیاں ہیں۔ بس یہ ایک نئی جو تم نے دی تھی اور یہ والی مشانکر بجاج کی دی ہوئی۔ تمہارے آنے کا سمے گجر گیا تو سوچا بیٹی جماؤں" لچھمی نے سب کپڑے سمیٹے اور ٹرنک میں بند کر دیے "اب کل جاؤں گی" اور وہیں سامنے چٹائی پہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی۔ پھر لچھمی بتانے لگی کہ کس طرح کل کی ہوا نے پریا کے گھر کے ٹین اُڑا دیئے۔

"نعیم تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں" جلال نے جمائی لے کر کہا "سگریٹ لے آؤں"۔ اس نے لچھمی کو اشارہ کیا اور چلا گیا۔

"جلال ــــ جلال" ـــ نعیم نے آواز دی اور دل ہی دل میں ایک موٹی سی خاموش گالی۔ خالہ نے کس مصیبت میں پھنسا دیا۔ لچھمی نے جلال کا اشارہ پا لیا تھا۔

"دیوداسی سے کیسے لگتا ہے بابو۔؟" اس نے ہنسکر پوچھا۔

نعیم کا گلا خشک ہونے لگا۔ جیسے وہ کوئی نوخیز لڑکی ہو اور شہدوں، اچکوں میں گھر گئی ہو۔ اس نے ایک بارگی پوری کوشش سے ہمت اکٹھی کی اور کھنکھار کر کہا۔

"پرے بیٹھو ـــ مجھے ان سب باتوں سے گھن نہیں آتی"

"چچ چچ۔ ایسے نا بولو بابو صاحب" لچھمی نے چھپر کھٹ چھو کر ماتھے کو ہاتھ لگایا۔ "ارے یہی تو ہمارا جیون ہے، پالن ہار ـــ ہم دیوداسیاں یہ سب نہ کریں تو کھائیں کہاں سے" ـــ

"تو تم دیودا سی نہیں ہی کیوں" — نعیم نے پوچھا۔

"ماں نے پیدا کیا" — سادہ سا جواب تھا۔

"چھوڑ تو سکتی ہو" —

"ہاں" — لچھمی نے 'ہاں' کو لمبا کھینچ کر کہا۔ "چھوڑ تو سکتے ہیں لیکن اب کیا کریں۔ اتنے گراہک بن گئے ہیں۔ اب کتنوں کا دل توڑیں"۔

نعیم نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور خاموش ہو رہا۔ دراصل وہ سوچ رہا تھا کہ کس پہلو سے اصلی بات چھیڑے۔

"جلال کیوں گیا ہے — سگریٹ تو میرے پاس تھے" — اس نے گویا اپنے آپ سے کہا۔

"تمہارے تلوں میں تیل ہے کہ نہیں دیکھنے گئے ہیں وہ" اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"اب تم اس کا پیچھا چھوڑ دو" نعیم نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "اب اس کی شادی ہونے والی ہے"۔

"جُگ جُگ جئیں جلال میاں" لچھمی واقعی خوش ہو کر بولی۔ "کب ہے شادی"۔

"جب تم اس کا دامن چھوڑ دو" — نعیم نے اس کے دل کی تہہ لینی چاہی۔

لچھمی نے کچھ دیر توقف کیا جیسے وہ بھی اپنے دل کو ٹٹول رہی ہو۔ پھر قہقہہ لگا کر بولی "یہ تم نے خوب کہی بابو صاحب۔ جلال پیارا تو آپ اپنی خوشی سے ادھر آتے ہیں۔ وہ نہ آئیں تب بھی دیوی کی کرپا سے اس پیٹ کا دال بھات کہیں نہیں گیا"۔ وہ پیٹ تھپتھپاتی ہوئی بولی۔ "نا آئیں" — ہاں — نا آئیں"۔

لیکن جلال نے لچھمی کے ہاں آنا نہیں چھوڑا۔ خانصاحب اور بیگم بھی اپنی ہٹ پر اڑی رہیں۔

"ارے کیا ہے۔ وہ کون تیرے راستے میں آئے گی"۔ بیگم نے کہا۔ "غریب گھر کی لڑکی ہے۔ یہاں آ کر اور بھیگی تو اپنے میں آپ مگن رہے گی تو جو جی چاہے کرنا"۔ دراصل بیگم کو یقین تھا کہ عقیلہ کی نزاکت اور حُسن کے آگے لچھمی اپنے آپ گہنا جائے گی۔ ان کے خیال میں جلال کو راستی پر لانے والا یہ آخری حربہ تھا۔ ورنہ خانصاحب کی بھری بندوق کی دھمکی نے تک بھی اسے لچھمی سے باز نہیں رکھا تھا۔ اس کا جیب خرچ کبھی کا بند ہو چکا تھا۔ لیکن اب وہ خود کافی کما لیتا۔ بلکہ گھر بھی اب اسی کے سہارے چلتا تھا کیونکہ لڑکیوں کی شادیاں نپٹاتے نپٹاتے خانصاحب کھوکھلے ہو چکے تھے۔ اور ایسا تھا بھی کتنا، رشوت کی کمائی کب تک چلتی۔ اور اسی پیسے کے بل پر اپنے زمانے میں کون سا شوق تھا جو خانصاحب نے پورا نہیں کیا۔ اسی لئے جب جلال کے نام پر ملنے جلنے والے کیچڑ اچھالتے تو وہ سنی ان سنی کر جاتے۔ اور بیگم تو کہیں کہ میرے

بچے کو مادر زاد نحیف دیکھ نہیں سکتے "۔ لیکن ایک بات کا ان کو بھی ملال تھا۔ خانصاحب نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ لیکن جلال نے وہ بھی بے تحاشہ پینی شروع کر دی تھی۔ آخر جلال کی بے راہ روی اتنی عام فہم بات ہو گئی کہ لوگوں نے تیوری تک چڑھانی چھوڑ دی۔

آخر ایک دن ایسا آیا کہ جلال شادی کے لئے رضامند ہو ہی گیا۔ شادی ہو گئی۔ عقیلہ بن ماں باپ کی لڑکی - دو غریب بھائیوں کی بہن۔ جہیز دہیز کہاں سے لاتی۔ اپنا اچھوتا حُسن بے نتنگ ساتھ لائی۔ ویسے جس گھر میں آئی وہاں کوفت بن برس رہا تھا آتے ہی اس نے چولہا چوکی سنبھال لی۔ سارا دن خاموش کام میں جٹی رہتی اور رات میں اس کے کان کسی آہٹ کے منتظر رہتے۔ اور اسی طرح کئی کئی دن گزر جاتے اور جلال ادھر کا رُخ نہیں کرتا۔ آتا بھی تو بڑے سوداگرانہ انداز سے۔ رفتہ رفتہ اس کے احساسات برف سے ڈھکتے گئے۔ مانگ کی افشاں اپنے آپ مالا پڑ گئی اور باورچی خانے کا دھواں اس کا بہت کچھ اپنے ساتھ اُڑا لے گیا۔ اور ساتھ ہی بیگم کے طعنے تیز تر ہوتے گئے کہ " لعنت ہے ایسی عورت پہ جو اپنے شوہر کو تک اپنے بس میں نہیں کر سکتی "۔ جلال کو بھی گویا ایک ضد سی ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ وہ بیمار پڑا تب بھی وہ آٹھ دن لچھمی ہی کے گھر پڑا رہا۔ شہباز خاں ہی اس کی عافیت لیا کرتا۔ اور شہباز خان ہی اس کے جاننے والوں میں اب بچا تھا جو اپنی وضعداری نبھائے جا رہا تھا ورنہ نعیم سے بھی اب جلال کی علیک سلیک راستے ہی میں ہوا کرتی۔ لیکن جب شہباز خاں نے اسے بتایا کہ جلال کو معمولی بخار نہیں بلکہ پیٹ میں السر ہو گیا ہے تو اس کا دل نہ مانا اور وہ اسے دیکھنے کے لئے گیا۔ وہ جلال کو کافی دنوں بعد دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ یہ وہی جلال ہے۔ " کیا بہت زیادہ پی رہے ہو " اسے فکر سے پوچھا۔

" نہیں تو " ـــــ جلال ہنسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

" ہاں بابو صاحب، بہت پیتے ہیں۔ مانتے نہیں۔ بیماری میں بھی پیتے ہیں "۔ لچھمی نے شکایت کی۔

کچھ دیر بیٹھ کر نعیم چلا آیا۔ لیکن اس کا دل جلال کو دیکھ کر بجھ سا گیا تھا اس دوران عقیلہ نے دوسرے لڑکے کو جنم دیا۔ خانصاحب اور بیگم اب زیادہ ہی جھلانے لگے کیونکہ کچھ دنوں سے جلال نے گھر کے خرچ میں کافی ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اب گویا عقیلہ اور اس کے بچوں کی ذمہ داری بھی خانصاحب کی پنشن پہ آ پڑی تھی ہوا یہ کہ لچھمی نے اب جیتے جی کسی اور مرد کی صورت نہ دیکھنے کی قسم کھا لی تھی۔ اور نتیجے کے طور پہ اسے داسی پورہ چھوڑنا پڑا تھا۔ اور جلال نے اس کے لئے ایک چھوٹا مکان کالج روڈ پر ہی خرید دیا تھا۔ جسے من چلوں نے " تاج محل " کہنا شروع کر دیا۔

" اب تو تیری اس منحوس صورت کو بھی ترسنے لگی ہوں "۔ جلال نے چار دن بعد صورت دکھائی

تو ماں نے کہا۔

جلال بالکل خاموش بیٹھا ان کی صلواتیں سنتا رہا۔ ان صلوٰتوں کا دھارا جلال سے مڑا تو حسب معمول عقیلہ کے سر پر گرا۔ حسب دستور وہ خاموش رہی۔

"گھنی کہیں کی ـــ پلو میں نمک باندھ کر یا ہر نہ گیا ہو تو کوئی بات نہیں" بیگم نے جیسے اس کی خاموشی سے مجبور ہو کر کہا۔ اور دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

"یہ سب سنکر تمہیں برا نہیں لگتا" جلال نے پہلی بار ملائمت سے عقیلہ سے پوچھا۔

"لگتا ہے" عقیلہ نے جواب دیا۔

"پھر تم کچھ کہتی کیوں نہیں ـــ؟"

"کس سے کہوں؟" اور وہ چھوٹو کو اٹھائے باہر چلی گئی۔

جلال نے بڑے لڑکے اجمل کو اپنے پاس بلایا۔ ڈر اور جھجک کے ملے جلے جذبات لئے جب وہ پاس پہنچا تو اس کے دونوں شانوں کو ہاتھوں سے تھامے ـ پہلی بار جلال نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اسے حیرت سی ہوئی کہ اس لڑکے کا باپ زندہ ہوتے ہوئے بھی اس کی صورت پر یتیمی کیوں برس رہی ہے۔ پھر وہ اس کی انگلی تھامے باہر نکل گیا۔ اور لچھمی کے یاں پہنچا۔ ویسے اس کا ہر راستہ لچھمی تک پہنچتا تھا۔ وہاں جاکر اجمل سہما سہما سا ایک طرف کو بیٹھ گیا۔

"آج تو چھوٹے راجہ بھی آئے ہیں" لچھمی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی بولی۔ اب وہ خاصی بھلی گرہستن لگنے لگی تھی۔ کاشنٹا تو وہ اب بھی لگاتی تھی لیکن جوڑا اب کھسک کر گردن پر آ گیا تھا۔ مانگ میں سہاگنوں کی نشانی سیندور بھی ضرور لگاتی۔ وہ اجمل کو چھیڑ چھیڑ کر باتیں کرتی رہی اور جلال کسی فکر میں ڈوبا آرام کرسی پر بیٹھا رہا۔

"کیا سوچ رہے ہو ـــ؟" لچھمی نے اچانک پوچھا۔

"کچھ نہیں" ـــ در اصل وہ کوشش کر رہا ہے کہ اپنے وقتی طور پر جاگے ہوئے ضمیر کو کچل دے۔ آخر اس کا کیا قصور تھا اگر عقیلہ دکھی تھی۔ اس نے تو صاف صاف کہدیا تھا کہ وہ کسی عورت کو لچھمی کی جگہ نہیں دے سکتا۔ پھر وہ کیوں اس کے گلے کا ہار بنائی گئی۔ لیکن پھر اس میں عقیلہ کا بھی کیا قصور تھا۔ اگر اس کے غریب بھائیوں نے اپنے سر کا بوجھ اتارنے کے لئے جان بوجھ کر اسے جلال کے پلے باندھ دیا تھا۔ اس نے بیزار ہو کر ایک لمبی سانس لی اور ایک ہی دھکے سے عقیلہ کے خیال کو اپنے ذہنی دروازے سے باہر نکال دیا۔ لیکن وہ اس سوال کو اپنے دماغ سے نہ نکال سکا جواب "نہتا" بن کر اس کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ بس ایک موہوم سا سوال تھا جو اچانک اس کے کانوں میں گنگنا اُٹھتا۔ وہ کبھی سوال کرنے والے کو جھڑک دیتا کبھی سمجھانے کی کوشش

کرتا۔ کبھی عاجزی سے گڑگڑاتا۔ لیکن ہر لمحہ یہ سوال ہوتا ضرور اس کے ساتھ۔ وہ کبھی کبھی سوچتا کہ یہ کہیں اس کی ہٹ دھرمی اور ضد ہی تو نہیں ہے۔ جو وہ لچھمی کو چھوڑتا نہیں ۔ آخر کو ایک نیچ، جاہل، بیوا کا ساتھ ہی کیا۔ لیکن نہیں ۔ اس نے واقعی لچھمی کو چاہا تھا اور اس نے بھی جی جان سے اس کا ساتھ دیا تھا۔ کیا ہوا جو وہ کبھی دیو داسی تھی وہ لچھمی کو کیسے چھوڑ سکتا تھا جس نے اپنا پیشہ اپنی جاتی سب کچھ اس کے لئے تیاگ دی۔ لیکن وہ اس سوال سے کس طرح چھٹکارا پائے جس کا طوق دن بدن اس کی گردن میں تنگ سے تنگ تر ہوتا جاتا تھا۔ وہ اس سوال سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ کئی بے نیند راتوں کے بعد صرف ایک راستہ نظر آیا۔ یہ کہ وہ عقیلہ اور دونوں بچّوں کے لئے بھی ایک مکان اور مستقل آمدنی کی کوئی صورت بنا دے۔ پھر وہ ایک صاف ضمیر انسان کی طرح اسے طلاق بھی دے سکتا ہے ۔ اس نے اپنی تمام تر توتیں لگا کر کام کرنا شروع کر دیا۔ معمولی معمولی مقدموں پر بھی وہ ایسے محنت کرتا ہے جیسے اسی پر ہی اس کے جینے اور مرنے کا دار و مدار ہو۔ صحت اس کی یوں بھی اچھی نہیں تھی اور اس مسلسل محنت نے اور بھی کہیں کا نہ رکھا۔ کبھی کبھی اس کے پیٹ میں اس شدّت کی تکلیف ہوتی کہ وہ سمجھتا کہ سانسوں سے رشتہ اب ٹوٹا کہ اب ٹوٹا۔ لیکن یہ شاید اس کی غیر معمولی قوت ارادی ہی تھی جو اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ پھر بھی کچے دھاگے کا یہ جھولا ایک دن ٹوٹ ہی گیا۔ ایک رات مقدمہ کی تیاری کرتے کرتے اچانک اس کی تکلیف بڑھی اور وہ کمرے سے لڑھک گیا۔ لچھمی بھاگ کر شہباز خاں کو بُلا لائی اور اپنے ساتھ ہی ڈاکٹر لے آیا۔ جلال کو فوراً ہسپتال منتقل کیا گیا۔ لیکن جیسے ہی پو پھٹی جلال کا طائر روح بھی اپنا آشیانہ چھوڑ کر کھلی فضاؤں میں پرواز کر لیا۔

سارا شہر جو زندہ جلال سے کتراتا تھا۔ اب اس کی موت پر افسوس کرتا خانصاحب کے پاس پہونچا۔ جلال کی موت پر عقیلہ کے بھائی بھی آئے۔

" اس منحوس نے کھا لیا میرے بچے کو " بیگم آنسو پونچھتی ہوئی بولیں۔

" ایسی بات نہ کہیے خالہ اماں ۔" عقیلہ کے بھائی نے سمجھایا۔ " سہاگ، تو اس کا اُجڑا ہے، یہ تو نصیب کی بات تھی ۔"

بیگم بپھر گئیں۔ " اس ڈائن کا تو ایک آنسو بھی نہیں نکلا ۔ یہ تو کسی اور گھر پڑ جائے گی۔ میرا بچہ مجھے اب کہاں ملے گا۔"

" ہم لاکھ غریب سہی خالہ ۔" بھائی نے کہا " لیکن غیرت ہم میں ہے اسے ہمارے آگے اتنا ذلیل نہ کیجیے۔"

" تو میاں ۔" خانصاحب کھانستے ہوئے بولے " کیا دو بھائی مل کر ایک بہن کو نہیں پال سکتے۔ لے جاؤ خوشی سے اپنے ساتھ۔ ٹھیک ہے بھائیوں کے گھر کی عزت بن کر رہے۔

دو چہرے فق ہو گئے ۔ چار آنکھیں سوالی نظروں سے ایک دوسرے کو تاکنے لگیں۔ جیسے ایک دوسرے

سے پوچھ رہے ہوں کہ "اگر ایسا ہو سکتا تو جانتے بوجھتے ہم اسے خندق میں دھکا کیوں دیتے"۔ خاموشی کے یہ چند لمحے عقیلہ سے بہت کچھ کہہ گئے۔

"ہچکچاؤ مت بھائی جان"۔۔۔ پہلی بار عقیلہ کی نپی تلی آواز گونجی۔ "اب میں کسی پہ بار نہیں ہونگی۔ جانتی ہوں تم مجبور ہو۔ لیکن اب میں مجبور نہیں ہوں۔ میرا ہر رشتہ اب ٹوٹ چکا۔ سوائے اس ایک رشتہ کے جو دنیا کا سب سے مضبوط رشتہ ہے۔ میں منو اور چھوٹو کی ماں ہوں۔ اب تم بھی میرے بازوؤں کا زور دیکھنا"۔ اس نے چھوٹو کو گود میں لیا اور اجمل کی انگلی پکڑی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

ایک لمحے کے لئے سکتہ سا ہو گیا۔ پھر دونوں بھائی عقیلہ کو روکنے کے لئے اٹھے کہ ایک دم دروازہ کھلا سامنے لچھمی کھڑی تھی۔ کھلے بال ویران آنکھیں۔ اس نے ہر چہرے پر بھرپور نظر ڈالی۔ پھر جھک کر عقیلہ کے پاؤں چھو لئے۔

"بی بی، تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ جاؤ گی تو صرف میرے سنگ۔ میں کون ہوں یہ بھول جاؤ بی بی۔ تمہارے پاؤں چھوتی ہوں۔

"تو کدھر سے گھس آئی۔ نکل جا یہاں سے ورنہ ابھی دھکے دے کر نکال دوں گا۔ خانصاحب گرجے۔

"میں نے آپ کا گھر ناپاک کیا ہے کھانصاحب۔ جانتی ہوں۔ مگر ساباج کھان یہاں آیا تھا اس نے باہر سے سُنا کہ بی بی پر جلیم ہو رہا ہے میرا دل نہ مانا میں انہیں لے جاؤں گی۔ ان کے پاؤں کی مٹی اپنے ماتھے لگاؤں گی"۔

"کمیوں ہریوں کے گھر ہماری بہن نہیں جائے گی"۔ بھائی آڑے آتے ہوئے بولے۔ "ہم اسے لے جائیں گے ۔۔ چل اکو"۔

لیکن عقیلہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"ایک بار تو تم نے میرا سودا کر دیا چھوٹے بھائی"۔ عقیلہ نے زہر بھری ہنسی سے کہا: "اب اور کیا چاہتے ہو۔"

"پھر بھی تو اس چنڈال کے ساتھ نہیں جا سکتی"۔ بیگم نے للکارا۔ "ہمارے نام کو بٹہ نہیں لگنے دیں گے۔ شریف لڑکیاں تو ڈولی میں سسرال آتی ہیں اور پھر ان کا ڈولا ہی وہاں سے نکلتا ہے"۔

لچھمی کھڑی آنسو بہاتی رہی۔

"اماں، پہلی بار مجھے محبت مل رہی ہے تو اس کی بھی دشمن کیوں ہو رہی ہیں آپ۔ میں پہلے تو اس کے گھر نہیں جا رہی تھی۔ لیکن اب ضرور جاؤں گی۔

لچھمی عقیلہ سے لپٹ گئی اور یہ چھوٹا سا قافلہ جانے کے لئے مڑا۔

"ٹھیک ہے" — بھائی جان نے کہا۔ "تو سمجھ لینا کہ تو آج سے ہمارے لئے مر گئی"

"میں تو بہت پہلے ہی مر چکی ہوں" — عقیلہ کی مدھم ہوتی ہوئی آواز آئی — "اب دوسرا جنم لونگی۔ اپنے بچّوں کے لئے۔"

جی۔آر۔سنتوش

ایک موت ایک مُسکراہٹ

باہر برستی سیاہ تاریک رات تھی۔ ستیش نرسنگ ہوم کے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ ایک خالی چارپائی تھی۔ ایک خالی پالنا تھا۔ جس میں نہ جانے کتنے نوزائیدہ بچّوں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اپنوں کو پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ وہ خالی پالنے پر نظریں جمائے اُس سفر کی سڑک پر چلنے لگا جس پر ہر انسان کو گامزن ہونا پڑتا ہے۔ اس پالنے سے قبر تک کی سڑک، طویل کٹھن سفر'۔۔۔۔۔۔ محبّت ایک پالنا ہے۔ انسان اس میں جھولنے والا بچہ ہے اور محبت کی تکمیل 'سفر' سڑک اور قدموں کا ایک اٹوٹ رشتہ، ریشم کے مہین تار سے بندھا ہوا۔ جس کا ایک سرا پالنے سے بندھا ہے اور دوسرا قبر سے۔۔۔۔۔۔ دل کی سوچیں نہ ہوتیں، تو زندگی کی تنہائیاں کتنی بے رنگ و بو ہوتیں؟ کتنی اذیت ناک ہوتیں!

ستیش نے اپنی آنکھیں موندلیں۔ یادوں کے مٹ میٹیالے سائے اس کے تصور میں پھیلنے، سمٹنے لگے۔ ایک لمبا فاصلہ بن گئے۔ اس نے حادثوں سے کھیلتے وہ فاصلہ ناپا تھا۔ اُس سفر میں اسے کئی لوگ ملے۔ اپنے جیسے، اپنے سے مختلف، کچھ بھولنے کے لئے، کچھ یاد رکھنے کے لئے، لیکن آشا سے مل کر وہ عرصے تک یہ فیصلہ نہ کر سکا۔ کہ اسے بھُول دیا جائے یا یاد رکھا جائے۔ عام سی ملاقات بھی گہرے نقوش چھوڑ سکتی ہے ایک انوکھی بات تھی۔ بالکل ویسی ہی جیسی آشا سے ملاقات۔ وہ کتابوں کی ایک دوکان میں کچھ کتابیں دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکی دوکان میں داخل ہوئی۔ لڑکی کیا تھی؟ ایک بجلی سی تھی جو اس کی آنکھوں کے سامنے کوندگئی اور دل کی گہرائیوں میں ڈوب گئی۔ گول چہرہ، پتلی پتلی ترچھی آنکھیں، چکنا سفید رنگ اس پر گلابی رنگ کی ساڑھی کا عکس، جیسے گلاب کی کلی پھُول بننے کی ایک بھرپُور انگڑائی لے رہی ہو۔ لڑکی نے دو تین کتابیں خریدیں اور چلی گئی۔ ستیش کی نظریں دُور تک لڑکی کا تعاقب کرتی رہیں۔ وہ دیر تک وہیں کھڑا سوچتا رہا۔ اپنے ماضی کو دیکھتا رہا۔ جب وہ دُور ہوتے ہوئے بھی اُس کے قریب تھا۔ ہر لمحہ اُس کی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ 'اگر میرا ماضی ایک لمحہ کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہو جائے' ۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بجھا ہوا دل میرا ساتھ دے

گیا۔۔۔۔۔۔!؟" ایک مہیب سوالیہ نشان اُس کی نگاہوں کے سامنے تھرتھرایا۔ سارا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا۔ وہ دوکان سے نیچے اُتر گیا۔

اُس ایک لمحے کی ملاقات اسے ایک عرصے تک یاد رہی۔ ملاقات کے خدوخال ایک مدّت تک اُس کی آنکھوں کے سامنے بنتے مٹتے رہے۔ اُن خدوخال کو نہ جانے اُس نے اپنی کتنی کہانیوں میں اُبھارا۔ پھر بھی ان سے چھٹکارا حاصل نہ کرسکا۔

ایک شام اپنے دوست کپور کے گھر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک ناکام اور مایوس انسان تھا۔ لیکن کپور کچھ بھی نہ ہوتے ہوئے ایک کامیاب اور مسرور انسان تھا۔ جس کی ہر تمنّا پوری ہوئی۔ جس کا ہر سپنا حقیقت بن جاتا۔ ستیش ان ہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ کپور آگیا۔ اُس کے ساتھ وہی لڑکی تھی۔ جسے وہ بھول جانا چاہتا تھا۔ جسے وہ غیر اختیاری طور پر یاد رکھنا چاہتا تھا۔ کپور نے تعارف کرایا۔

"آشا سے ملو"

اُس کے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔

'پہلے بھی ایک بار مل چکا ہوں'

"آشا چونکی"۔

'کہاں؟'

کپور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

'سپنے میں، جو ایک کہانی بن گیا۔ کہانی بن کر بک گیا'

آشا کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ اُبھری۔ جیسے کنول کے پنکھ ہل گئے ہوں۔

اُس نے خود اپنا تعارف کرایا۔ 'مجھے ستیش کہتے ہیں'

کپور نے بات بڑھائی۔ 'صرف ستیش ہی نہیں ہے۔ ایک کہانی کار بھی ہے۔ اور۔۔۔۔۔؟'

آشا نے اُس کی بات کاٹ دی۔

'اتنے خوبصورت لوگ تمہارے بھی دوست ہوسکتے ہیں۔ پہلی بار معلوم ہوا'

کپور نے ستیش کو کنکھیوں سے دیکھا۔۔

'خوبصورتی سے تمہارا مطلب؟'

"خوبصورت خیالوں سے"

کپور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"میں نے سوچا، خوبصورت جسم سے ہے"

آشا نے بھی اسی لہجے میں بات کی،

"پھر تو تمہارا مقابلہ مشکل ہے"

وہ ستیش سے مخاطب ہوئی۔ آپ کی کہانیاں پڑھی ہیں۔ آپ سے مل کر مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوا۔ البتہ اتنی حیرانی ضرور ہوئی کہ کپور آپ کا دوست ہے"

ستیش نے دبی زبان میں کہا

"کپور ایک اچھا دوست ہے"

آشا نے کپور کو دیکھا "! اچھا دوست اچھا انسان ہی ہوتا ہے"

کپور نے بلند آواز سے کہا "کیا میں اچھا انسان نہیں؟"

آشا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا وہ ستیش کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔

ایک کہانی اپنی کہانی سُنا رہی تھی۔ ایک کہانی کار اپنی کہانی کی باتیں سُننے میں محو تھا۔ باتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ آشا بولتی رہی وہ سنتا رہا۔ باتوں کا یہ سلسلہ کب ختم ہوا۔ ایک دوسرے سے کب رخصت ہوئے کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ شاید وہ اس ملاقات کو بھی ایک خوبصورت حادثہ سمجھ کر بھول ہی جاتا۔ کیونکہ اس کی زندگی میں ایسے کئی حادثے ہوتے رہے لڑکیاں آئیں اور چلی گئیں۔ خوبصورت کہانیاں دے گئیں۔ خوبصورت کہانیاں چھین لے گئیں۔ اور زندگی یوں ہی بھٹکتی رہی۔ ...... لیکن ......؟! وہ دیر تک کپور اور آشا کے بارے میں سوچتا رہا۔ بے میل سے ساتھ کی بے جوڑ سوچیں تھیں۔ وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

دن ڈھلتے رہے۔ شامیں ہوتی رہیں۔ اور جسم میں آتی رہیں۔ آشا اور اس کی ملاقات کا سلسلہ بڑھتا گیا فاصلے سمٹتے گئے۔ دو وجود الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک ہو گئے۔ آشا اُسے دل و جان سے چاہنے لگی تھی۔ اُس کے چھوٹے سے چھوٹے دکھ پر اپنی بڑی سے بڑی خوشی قربان کرتی رہی۔ لیکن وہ بسیار کوشش کرنے پر بھی اُسے اپنے دل کی بات نہ کہہ سکا۔ اُسے پیار کے دو بول نہ کہہ سکا۔ آشا کو کچھ کچھ معلوم تھا۔ کہ اس کے قُرب میں کتنی دوری ہے؟ —— زندگی میں ایسے بھی لمحے آتے ہیں۔ کہ آدمی کسی کو چاہنے کے باوجود چاہنے لگتا ہے اور کسی کو چاہنے کے باوجود۔ اور کسی کو چاہنے کے باوجود اپنا نہیں سکتا۔ اُس نے ایک دن باتوں باتوں میں آشا سے پوچھا۔

"آشا، زندگی میں ایک عمر ایسی بھی آتی ہے۔ جب کسی ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؛

آشا نے اپنی کہی 'ہر عمر ساتھی چاہتی ہے،

اُس نے آشا کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

" تمہیں کبھی کسی ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہوگی ؟'

' ہوتی ہوگی اور نہیں بھی ہوئی ہوگی،

' ایسا کیوں ؟"

' اس لئے کہ چاہنا اپنے ہاتھ میں ہے اور اپنانا اپنے بس کی بات نہیں،

ستیش نے چھیڑنے کی کوشش کی۔

' کپور ایک اچھا ساتھی بن سکتا ہے،

آشا نے اُسی لہجے میں کہا ' کپور ایک بگڑا ہوا انسان ہے ؟

' اُسے سنبھالنے والا ایک اچھا ساتھی ہو تو سنبھل سکتا ہے،

آشا نے اسے گھور کر دیکھا۔

تم کپور کو چاہتے ہو ؟ '

وہاں اُس سے پیار بھی کرتا ہوں اور تم ؟ '

' آج تک کبھی سوچا نہیں ہے،

' لیکن تمہارا بچپن کا ساتھی ہے،

' اسی لئے آج تک ساتھ نبھا رہی ہوں حالانکہ......؛'

' تم نہیں چاہتیں کہ وہ ایک اچھا انسان بن جائے۔ ایک بگڑا ہوا بچپن سدھر جائے ؟ '

' یہ تو میں چاہتی ہوں،

' بچپن میں تمہیں اُس سے پیار تھا ؟ '

' وہاں،

لڑکپن میں ؟

' ہاں،

' جوانی میں ؟'

' کبھی تھا اب نہیں۔ اب مجھے اُس سے نفرت ہے،

' کیوں ؟'

' اس لئے کہ پہلے وہ ایک خوبصورت انسان تھا۔ اب ایک بدنما داغ۔ جسے زندگی اور زندہ انسانوں سے کوئی سروکار نہیں '

' لیکن اسے زندگی اور زندہ انسانوں کا احساس تو ہے '

' وہ بھی اب مرٹ چکا ہے '

' اسے دوبارہ جگایا جا سکتا ہے '

' تم کہانی کار ہو۔ تم ——— ! '

' میں سب کچھ ہوں۔ لیکن تمہارے لئے کچھ بھی نہیں۔ دوسروں کے لئے ایک چلتا پھرتا حساس انسان ہوں اپنے اور تمہارے لئے ماضی کا منحوس سایہ، جو نہ خود پنپتا ہے نہ دوسروں کو پنپنے دیتا ہے '

' لیکن جینے کے لئے تو کسی نہ کسی زندہ سہارے کی ضرورت ہوتی ہے '

' سہارا میں نے تم میں پالیا '

' میں نہ رہی تو ؟ '

' میں تمہاری کسی یاد کو زندہ سہارا سمجھ کر جینے کی کوشش کروں گا۔ اپنی بھٹکی ہوئی زندگی کو اُس کے سہارے سنبھالنے کی کوشش کروں گا '

آشا کی آنکھیں غمناک ہوگئیں۔

ماضی کا مکروہ سایہ ستیش سے لپٹ گیا۔

ایک حسین ملاقات آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

ایسے ہی کئی دفعہ اُس نے آشا کے دل کو ٹٹولا۔ لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ وہ جس بات کی انتظار میں تھا۔ وہ بات کبھی آشا کے مُنہ سے نہ نکل سکی جس راستے کو وہ سنوارنا چاہتا تھا۔ وہ اور بھی اُجڑتا چلا گیا۔ کپور حد سے زیادہ پینے لگا۔ اُس کی باتوں میں تیزی سی آگئی تھی۔ ایک چبھن سی پیدا ہوگئی تھی۔ آشا بھی کچھ کچھ پریشان سی رہنے لگی۔ ستیش سب کچھ سمجھنے کے باوجود سمجھنے سے قاصر تھا۔

وقت اپنا ہو۔ ساتھی خوبصورت ہو۔ وقتی ہی کیوں نہ سہی۔ سبھی چاہتے ہیں کہ زندگی ایسے ہی گذر جائے۔ لیکن زندگی ایک وہ حسین لمحہ ہے جو پلک جھپکتے گذر جاتا ہے۔ صرف اس کی تلخ یاد دل کے نہاں خانوں میں کبھی اُبھرتی ہے کبھی ڈوب جاتی ہے۔ آشا خوبصورت تھی۔ ستیش سے پیار کرتی تھی۔ اُس کی ادھوری زندگی کو مکمل کر سکتی تھی۔ ایک مایوس زندگی کو اُمیدوں کے پھولوں سے سجا سکتی تھی۔ ایک غم زدہ زندگی کا دامن خوشیوں سے بھر سکتی تھی۔ لیکن ستیش کی زندگی ایک المیہ داستان تھی۔ جس کی ابتدا ایک روگ ماضی سے ہوئی تھی۔ اُس کی تمام تر

سوچیں ماضی کی دُنیا سے وابستہ تھیں۔ خیال ہر لمحے ماضی کی طرف پرواز کرتے۔ اس کی زندگی مستقبل کی طرف دوڑتے دوڑتے یکبارگی ماضی کی طرف لڑھک جاتی۔ اس نے کئی بار چاہا کہ ماضی کی کتاب کو ہمیشہ کے لئے بند کر دے لیکن ہر لمحے زندگی کے تیز تند ہواؤں نے کتاب کے اوراق کو الٹ پلٹ دیا اور ہر بار ماضی اُس کے حال پہ چھا گیا۔

آشا کی جن آنکھوں کو اُس نے ہمیشہ مسکراتے دیکھا اور جن مسکراتی آنکھوں کو دیکھ کر اس نے جینے کی کوشش کی وہ آج رو رہی تھیں۔ ان میں آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ تڑپ اُٹھا۔ اُس کی اپنی کہانی کے آنسو تھے۔ کیسے برداشت کرتا۔

اُس نے آشا سے پُوچھا۔

کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم کھوئی کھوئی سی رہتی ہو،

آشا نے رندھے ہوئے گلے سے جواب دیا ‹ میری شادی کی بات ہو رہی ہے ›

‹ کس سے؟ ›

‹ کپور سے ›

ستیش کے ہونٹوں پر ایک لمبی مسکراہٹ پھیل گئی۔ آشا دیکھ کر تڑپ اٹھی۔

‹ میں رو رہی ہوں اور تم مسکرا رہے ہو ›

‹ مسکراہٹ خوشی کی بھی ہو سکتی ہے اور مسکراہٹ تلخ بھی ہو سکتی ہے ›

‹ لیکن بات میری شادی کی ہے ›

ستیش نے سنجیدہ لہجے میں کہا ‹ شادی ہر لڑکی کی ہوتی ہے۔ اور ہر لڑکی شادی کا نام سُن کر خوش آئندہ مستقبل کے رنگین خواب دیکھتی ہے۔ جہاں اُس کا سہاگ ہوتا ہے ایک اپنا گھر اور گھر کے آنگن میں ہنستے کھیلتے بچے ہوتے ہیں ›

آشا اُسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

‹ تم سمجھتی ہو کہ میری شادی ہو رہی ہے ــــ نہیں ــــ میری آرزوؤں کی چتا بنائی جا رہی ہے ›، ستیش خاموش رہا۔ آشا سسکیاں بھرنے لگی۔

‹ میں نے پیار کیا ہے اور پیار کا تکمیل چاہتی ہوں ›

ستیش نے مسکرانے کی کوشش کی ‹ پیار سبھی کرتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ پیار کو سبھی پا سکیں ›

آشا کا لہجہ تیز ہوا ‹ یہ جو کچھ آج تک ہوتا رہا کیا وہ سب خواب تھا؟ ›

"خواب نہیں تھا۔ ایک حقیقت تھی جس پر کبھی کبھی خواب کا سا گمان بھی ہوتا ہے،"

آشا بپھر گئی، پیار کرتے رہے اور بندھنوں سے گھبرانے لگے،

تھوڑی دیر ستیش پر سکتہ کا سا عالم طاری رہا۔ قدرے توقف کے بعد اُس نے آشا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم نے مجھے چاہا۔ میں جانتا ہوں۔ تمہارے ساتھ میں نے بھی ایک رشتہ جوڑ لیا۔ تم نہیں جانتیں!"

آشا نے بولنا چاہا لیکن ستیش نے بات جاری رکھی۔

تمہارے ساتھ نے مجھے وہ سب کچھ دیا۔ جس کا میں تمنائی ہوں،

آشا کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم کہانی کار ہو۔ کسی کے رونے اور ہنسنے کو صرف کہانی کا رُوپ دے سکتے ہو۔ خوابوں کی دنیا کے انسان ہو۔ حقیقتوں سے ڈرتے ہو!"

ستیش نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اس میں شک نہیں کہ میں کہانی کار ہوں۔ زندگی کے ہر موڑ کو کہانی کا روپ دے سکتا ہوں۔ لیکن کئی ایک ایسے لمحے بھی ہوتے ہیں۔ جو کہانی نہیں بن سکتے۔ جو صرف ایک خلش بن کر دل کی گہرائیوں میں سسکتے رہتے ہیں پیار ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ جو کبھی نہیں ٹوٹتا۔ ایک مقدس بندھن ہے۔ جس سے ہمارے روح ہمیشہ بندھے رہتے ہیں،"

آشا نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں تمہیں ہمیشہ بلند انسان سمجھتی رہی۔ لیکن تم بھی ایک بگڑے ہوئے انسان نکلے،"

ستیش کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ اُبھر کر ڈوب گئی۔

"یہ تمہیں آج محسوس ہوا۔ کیونکہ ایک بھٹکا ہوا انسان ہے۔ سنبھل سکتا ہے۔ میری ایک بھٹکی زندگی ہے۔ کیونکہ اس کے پیچھے بھی تم سے ملتی جلتی ایک پرچھائیں ہے۔ کاش وہ تمہاری پرچھائیں ہوتی!

"تمہارا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔؟"

اُس نے بات کاٹ دی: کپور میرا دوست ہے۔ ہم دونوں بہت پیچھے سے ایک ساتھ چلے ہیں،

آشا خاموش ہو گئی۔ ہمیشہ کے لئے پتھر بن گئی۔

۔۔۔ وہ رات ایسی ہی دہشت ناک رات تھی۔ ستیش ساری رات ماضی اور حال کے درمیان لٹکتا رہا کبھی ماضی سے وابستہ دنیا اپنی تاریکیوں کی طرف کھینچتی رہی، اور کبھی حال مجبور آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ وہ۔

بس تھا کچھ بھی نہ کر سکا۔ اُس پہ ایک سایہ مسلّط تھا۔ کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔

ستیش نہیں جانتا تھا کہ آشا اسے سمجھ سکی یا نہیں۔ البتہ آشا نے اس کی بات مان لی اور اس کی شادی بچپن کے ساتھی کپور کے ساتھ ہوگئی۔ ستیش کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کپور اس کی شادی سے خوش بھی تھا یا نہیں۔ لیکن جس مقصد کے خاطر ستیش نے آشا کو کپور سے شادی کرنے پر رضامند کیا۔ وہ مقصد پورا ہوتا نہیں دکھائی دیا۔ اس نے سوچا تھا۔ کہ کپور کی بگڑی ہوئی زندگی سنبھل جائے۔ لیکن سنبھلنے کی بجائے اس کی حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ وہ آج کئی مہینے سے گھر سے باہر رہ رہا تھا۔ خود ستیش نے کئی بار معاملہ کے تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ کچھ بھی نہ پاسکا۔ کئی بار اُسے گھر لوٹنے کی منتیں کیں۔ لیکن کپور ٹالتا ہی رہا۔

بات کیا تھی کیا نہ تھی وہ قطعی طور کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ ایک طرف وہ کپور کی حالت دیکھ کر گھبرا جاتا، سہم جاتا۔ اور دوسری طرف آشا کو دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتا۔ آشا اپنی ہی صورت کی ایک کھنڈر بن کر رہ گئی تھی۔ ستیش اُسے ایسے دیکھتا جیسے اس کی زندگی بخش سپنوں کو تاریک ویرانیاں دی ہوں ——— لیکن وہ خود ایک ..... !

خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ ساتھ کے کمرے میں کسی نوزائیدہ بچّے نے شاید پالنے کا لمس پالیا تھا اور اب اُسے ماں کی چھاتیوں کی تلاش تھی۔ اُس نے اپنے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ خالی پالنا کو دیکھا خالی چارپائی کو دیکھا۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر تا ایک سیاہ رات کو دیکھا۔ جواب بھی برس رہی تھی۔ آشا کو نرسنگ ہوم لے جانے سے پہلے اُس نے کپور کو اطلاع دی تھی ——— تمہارا ہونے والا بچّہ تمہاری راہ دیکھ رہا ہے؛ لیکن کپور ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ بُت بنا خاموش سنسان رات کی تاریکیوں کو دیکھ رہا تھا۔

نرس بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی 'مریض کی حالت خطرناک ہے کیا ابھی تک ان کے پتی نہیں آئے۔؟'

ستیش صرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ کوئی جواب نہ دے سکا۔ بوجھل احساسات تلے دبا ہُوا کرسی میں دھنستا رہا۔ آج پہلی بار اس میں جی بھر کر رونے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کا سارا وجود آشا کے لئے رو اُٹھا۔ ماضی کے پھیلے ہوئے یادوں کو اس نے جتنا سمیٹنے کی کوشش کی اتنے ہی وہ پھیلتے گئے۔

رات موت کی طرح یخ، ٹھنڈی اور بھیانک تھی۔ اُس کی زندگی کی ایک ایک ملاقات، ایک ایک حادثہ گم کھڑے ہوئے اوراق کی طرح اُڑتا چلا جارہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے برستی رات کے اندھیروں میں تحلیل ہوتا جارہا تھا۔ کسی نے جیسے اُسے دور سے پکارا۔ خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ کپور تھا۔

نشے میں دھت ستیش نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن کپور آنکھیں نہ ملا سکا۔ جلدی جلدی پاس پڑی کرسی میں دھنس گیا۔ اور ٹانگیں پھیلا کر سو گیا۔ اُس کی بیوی آج ماں بن رہی تھی۔ اس کی جیون ساتھی کی حالت خطرناک تھی۔ اس نے پوچھا تک نہیں۔ نہ نئی زندگی کے بارے میں اور نہ ہی پرانی زندگی کے متعلق۔

کپور ساری رات نشے میں دھت پڑا رہا۔ ستیش ساری رات جاگتا رہا۔ صبح ہونے پر آشا کو کمرے میں لایا گیا ہے۔ پالنا آپ ہی آپ جھولنے لگا۔ انسان کی پہلی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ چہرہ مسکرا اُٹھا آشا کی بے نور آنکھیں بھی چمک اُٹھیں۔ اس نے آنکھیں گھما کر کپور کو دیکھا۔ آنکھوں کی چمک ڈوب گئی۔ مایوسی کی ان گنت لکیریں اُس کے مرے ہوئے چہرے پر ابھر آئیں۔ آنکھوں میں ممتا کی چمک جیسے بجھ گئی۔ ستیش کو دیکھا اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ دم بخود سا آشا کے پاس گیا۔ آشا نے نرس کو پالنا میں سے بچے کو اٹھا لانے کے لئے کہا۔ نرس بچہ سنبھالے پاس لے گئی۔ آشا نے اپنے کمزور ہاتھوں سے نرس سے بچہ لے کر ستیش کے ہاتھوں میں رکھ دیا اور مری ہوئی آواز میں کہا۔

"میں نے تمہاری بات مان لی۔ اب اپنی زندگی کے لئے میری بھی ایک بات مان لو۔ اس چھوٹے سے سہارے سے، ہو سکتا ہے کہ تمہاری بھٹکی ہوئی زندگی سنبھل جائے"۔

کپور نے عورت اور زندگی دونوں کو حقارت سے دیکھا اور باہر نکل گیا۔ ستیش دونوں کو اپنے سینے سے لگائے دیر تک کھڑا رہا۔ موت نے اُسے ایک مسکراہٹ کا سہارا بخشا تھا۔ وہ کتنا خوش قسمت تھا۔ کتنا بدقسمت تھا۔!!

موہن یادو

سوتے گاؤں کا شیر

میں نے لاکھ کوشش کی کہ سوتے گاؤں کے صوبیدار شیر سنگھ کا چہرہ میری نظروں سے اوجھل ہو جائے لیکن یہ چہرہ، اپنی شخصیت، زندہ دلی، بہادری اور ہمدردی سے اس قدر مجھ پہ چھا گیا کہ سوتے جاگتے میں وہی میرے سامنے رہنے لگا۔

شیر سنگھ فوج میں سپاہی بھرتی ہوا تھا اور کئی میدان مارنے کے بعد صوبیدار تک پہونچا تھا۔ شیر سنگھ سوتے گاؤں کا شیر تھا۔ لیکن سوتے گاؤں کے ساتھ والے لوگ کہتے تھے، جس گاؤں کا نام ہی سوتے ہو۔ وہاں کون جاگتا ہوگا۔ اور اس گاؤں کا نام تھا بہادر گاؤں، بہادر گاؤں کے لوگ دو ہی کام کرتے تھے، فوج میں بھرتی ہوتے تھے یا ڈاکے ڈالتے تھے۔

بہادر گاؤں والے کافی دلیر قسم کے لوگ تھے، انہیں سوتے گاؤں یا دوسرے گاؤں والوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یوں، بھی بہادر گاؤں والوں کا ایک اصول تھا کہ آس پاس کے گاؤں میں ڈاکہ نہیں ڈالا جائے گا اور اس پر یہ لوگ پوری طرح کاربند تھے۔

ایک دن ——

شیر سنگھ کے پاس نواں گاؤں سے کچھ لوگ آئے۔ یہ لوگ رو چلّا رہے تھے گو ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ لیکن وہ پھر بھی رو رہے تھے۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب شیر سنگھ فوج میں بھرتی نہیں ہوا تھا بلکہ آزاد پنچھی کی طرح آزاد گاؤں میں گھومتا رہتا تھا۔

جو لوگ رو رہے تھے، اُن میں ایک بوڑھا کیسی تھا، جو زار و قطار رو رہا تھا اور کہتا تھا۔

"میری بیٹی کو اُٹھا کر لے گئے۔ ڈاکو۔ میری بیٹی۔"

شیر سنگھ سمجھ گیا کہ بوڑھے کی بیٹی کو کون اُٹھا کر لے گئے تھے۔

شیر سنگھ نے کہا: "بابا۔ تم گھر جاؤ۔ کل صبح کے سورج چڑھنے سے پہلے تمہاری بیٹی تمہارے گھر پہونچ جائے گی۔"

شیر سنگھ نے بندوق اُٹھالی۔ اور گھوڑے پر بیٹھ کر یہ جا، وہ جا، ہوا ہو گیا۔

دوسری صبح ــــــ

سُورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی شیر سنگھ نواں گاؤں پہنچ چکا تھا۔ بُوڑھے کی بیٹی کو لے کر۔

تب نواں گاؤں سے لے کر بہادر گاؤں تک سب کو علم ہو گیا کہ سوتے گاؤں کا صرف نام ہی اُلٹا ہے۔ بلکہ وہاں لوگ تو جاگتے رہتے ہیں۔

بوڑھے نے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک بہادر گاؤں کے بے شمار ناٹک دیکھے تھے، کارنامے سُنے تھے۔ لیکن اس نے ایسا کارنامہ نہیں سُنا تھا، ایسا ناٹک نہیں دیکھا تھا کہ بہادر گاؤں کے ڈاکو اس کی بیٹی کو اُٹھا کر لے گئے تھے اور شیر سنگھ اکیلا دشمنوں کے گھر سے اُس کی بیٹی کو واپس لے آیا تھا۔

اور بوڑھے نے کہا ــــ

"شیر سنگھ۔ اب میرا اس لڑکی پر کوئی حق نہیں رہا۔ میں اس کی حفاظت نہیں کر سکا۔ اور تم ــ تُم ــ" بوڑھا باپ آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ صرف شیر سنگھ نے اتنا ہی کہا۔

"مجھے آشیر داد دیجئے بابا ــ میں آپ کا بیٹا ہوں۔"

اور بُوڑھے کی رکمنی شیر سنگھ کی دُلہن بن کر چلی گئی۔

بہادر گاؤں والوں کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ شیر سنگھ کے سامنے کون جائے۔ کس کی جرأت تھی۔ کس کی مجال تھی کہ شیر کے غار میں ہاتھ ڈال دے۔ شیر سنگھ جب غصہ میں آجاتا تو سوتے گاؤں کی اونچی اونچی پہاڑیاں بھی کانپنے لگتیں۔

سوتے گاؤں کے لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے یا فوج میں نوکر ہو کر دیش کی سیوا کرتے تھے۔ شیر سنگھ کے پاس نہ تو کھیت تھے اور نہ ہی پیسے کہ وہ ہل چلاتا، اس کے باپ دادا بھی فوج میں تھے۔ اس لئے اُسے بھی باپ دادا کی ڈگر پر چل کر روایت کو زندہ رکھنا تھا۔

اور شیر سنگھ فوج میں بھرتی ہو گیا ــــ

سال کے بعد جب وہ ایک مہینے کی چھٹی پر گھر آتا تو رُکمنی کے لئے بے شمار چیزیں لاتا۔ کپڑے۔ دھوتیاں۔ جوتیاں، پراندے، صابن، بندی، گجرے، تیل اور جانے کیا کیا۔؟

اور رکمنی گیارہ مہینے کی جدائی بُھول جاتی۔ اور شیر سنگھ کی شیرنی بن کر پھولی نہیں سماتی۔

رکمنی نے ایک نہیں بلکہ سات شیر پیدا کئے۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر۔

جب ساتوں جوان ہوئے تو اس وقت شیر سنگھ کی ایک ٹانگ کٹ چکی تھی، چہرے پر کئی گولیوں کے نشان

تھے۔ لیکن وہ پھر بھی شیر سنگھ تھا۔
اس کے ساتوں شیر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ خاندانی روائیت کے مطابق۔
ان سات شیروں کی بھی الگ کہانی ہے۔
جب ایک دیش کے کام آجاتا تو دوسرا فوج میں بھرتی ہو جاتا۔ یہ سلسلہ اس کے ساتویں بچے پر آ کر ختم ہو گیا۔ اس نے رکمنی سے پھر بھی یہی کہا۔
" رکمنی ابھی میرے بہت بچے ہیں۔ سوتے گاؤں کے تمام بچے میرے ہیں۔ تمہارے ہیں۔ یہ بھی تمہارے کرنیلے کی طرح بہادر ہیں۔ تمہارے جرنیلے کی طرح شیر ہیں۔ تمہارے بھتے کی طرح دلیر ہیں۔ یہ سب فوج میں بھرتی ہوں گے اور ماں کا قرض چکائیں گے۔ دھرتی ماں کا قرض۔"
رکمنی نے صرف اتنا ہی کہا۔
" میرے شیر۔ یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔"
اور یہ بھی بھگوان کی لیلا تھی کہ ایک دن رکمنی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روٹھ کر چلی گئی۔
سات بیٹوں کی ماں بھی چلی گئی۔ جسے دیکھ کر وہ اپنے بیٹوں کو بھول جاتا تھا۔ رکمنی اس کے بڑھاپے کا سہارا۔ یہ بھی بھگوان کی لیلا تھی۔
اب اس نے لاٹھی کا سہارا لے لیا۔ اور گاؤں میں ادھر ادھر گھوم کر شام کو گھر لوٹ آتا۔ پنشن ملتی تھی۔ اکیلی جان گذر کر لیتی تھی۔
اب بھی سوتے گاؤں میں کرنیل اور جرنیل جیسے بیٹے پیدا ہو رہے تھے اور بوڑھا شیر سنگھ خوش تھا۔ کہ اس کے گاؤں کا نام سدا زندہ رہے گا۔ سدا بہادروں کو جنم دیتا رہے گا۔ وہ بہادر جو شہتیروں جتنے لمبے ہوتے تھے اور شیروں کی طرح بہادر۔
ایک بار۔
پھر لہا در گاؤں والوں نے پرانی دشمنی کو تازہ کیا۔ اور بزرگوں سے سنی ہوئی کہانی کو نئے سرے سے لکھا۔
سوتے گاؤں کے نمبردار کی بیٹی کو اٹھا کر لے گئے۔
ابھی لٹیرے نمبردار کی بیٹی کو اٹھا کر سوتے گاؤں کی حدود سے باہر ہی نہیں نکلے تھے کہ سامنے سے شیر سنگھ آگیا۔ اس کے ہاتھ میں دونالی تھی۔
ایک بدمعاش نے کہا: " ارے بوڑھے۔ راستے سے ہٹ جاو ورنہ کچلے جاؤ گے۔"
شیر سنگھ نے گرج کر کہا: " میں بوڑھا۔ شیر سنگھ بوڑھا۔ اپنے گھر والوں سے پوچھ کر آنا تھا کہ

سوتے گاؤں میں کوئی شیر سنگھ بھی رہتا ہے۔"

"شیر سنگھ — لنگڑا شیر سنگھ"

سبھی بدمعاش قہقہے پر قہقہے لگاتے رہے "بڑا آیا شیر سنگھ۔"

شیر سنگھ کا بس اتنا ہی سُننا تھا کہ وہ بپھر گیا — اور گولی نکلی — ایک گولی، دوسری گولی تیسری گولی"

بہادر گاؤں کے کمینے بزدل اور ڈرپوک اس طرح بھاگے، جس طرح چور بھاگتا ہے۔

بعض مارے گئے۔ اور بعض ماؤں کی گودیوں میں جاکر چھپ گئے۔

"شیر سنگھ ابھی زندہ ہے — شیر سنگھ ابھی زندہ ہے۔"

سوتے گاؤں کے سارے لوگ نمبردار کے گھر جمع ہوگئے تھے۔ لیکن کسی کو شیر سنگھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک نے پوچھا۔

"نمبردار شیر سنگھ کہاں ہے؟"

دوسرے نے کہا۔

"شیر سنگھ کو ڈھونڈ لاؤ۔ وہی کوئی اُپائے سوچے گا۔"

تب نمبردار کی لڑکی آگئی۔

"بابُو —"

نمبردار نے کہا — "بیٹی۔ تم۔ آگئیں۔"

"ہاں بابُو میں آگئی۔ بابا شیر سنگھ نے مجھے بچا لیا۔" اور پھر نمبردار کی بیٹی رونے لگی۔

صُبح ہوئی تو سوتے گاؤں کے لوگوں نے دیکھا کہ شیر سنگھ دھرتی سے لپٹ کر بڑے آرام کی نیند سو رہا تھا۔

اور بندوق اس کی گود میں تھی۔ جیسے کوئی ننھا بچّہ سو رہا ہو — ماں سے لپٹ کر — اور ماں بھی خاموش تھی۔

اور بچّہ بھی ۔۔۔

—— ● ——

تھے۔ لیکن وہ پھر بھی شیر سنگھ تھا۔

اس کے ساتوں شیر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ خاندانی روایت کے مطابق۔

ان سات شیروں کی بھی الگ کہانی ہے۔

جب ایک دیش کے کام آجاتا تو دوسرا فوج میں بھرتی ہو جاتا۔ یہ سلسلہ اس کے ساتویں بچے پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔ اس نے رکمنی سے پھر بھی یہی کہا۔

"رکمنی ابھی میرے بہت بچے ہیں۔ سوتے گاؤں کے تمام بچے میرے ہیں۔ تمہارے ہیں۔ یہ بھی تمہارے کرنیلے کی طرح بہادر ہیں۔ تمہارے جرنیلے کی طرح شیر ہیں۔ تمہارے ہمتے کی طرح دلیر ہیں۔ یہ سب فوج میں بھرتی ہوں گے اور ماں کا قرض چکائیں گے۔ دھرتی ماں کا قرض۔"

رکمنی نے صرف اتنا ہی کہا۔

"میرے شیر۔ یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔"

اور یہ بھی بھگوان کی لیلا تھی کہ ایک دن رکمنی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روٹھ کر چلی گئی۔

سات بیٹوں کی ماں بھی چلی گئی۔ جسے دیکھ کر وہ اپنے بیٹوں کو بھول جاتا تھا۔ رکمنی اس کے بڑھاپے کا سہارا۔ یہ بھی بھگوان کی لیلا تھی۔

اب اس نے لاٹھی کا سہارا لے لیا۔ اور گاؤں میں اِدھر اُدھر گھوم کر شام کو گھر لوٹ آتا۔ بس پنشن ملتی تھی۔ اکیلی جان گذر کر لیتی تھی۔

اب بھی سوتے گاؤں میں کرنیل اور جرنیل جیسے بیٹے پیدا ہو رہے تھے اور بوڑھا شیر سنگھ خوش تھا۔ کہ اس کے گاؤں کا نام سدا زندہ رہے گا۔ سدا بہادروں کو جنم دیتا رہے گا۔ وہ بہادر جو شہتیروں جتنے لمبے ہوتے تھے اور شیروں کی طرح بہادر۔

ایک بار۔

پھر بہادر گاؤں والوں نے پرانی دشمنی کو تازہ کیا۔ اور بزرگوں سے سنی ہوئی کہانی کو نئے سرے سے لکھا۔ سوتے گاؤں کے نمبردار کی بیٹی کو اٹھا کر لے گئے۔

ابھی لٹیرے نمبردار کی بیٹی کو اُڑا کر سوتے گاؤں کی حدود سے باہر ہی نہیں نکلے تھے کہ سامنے سے شیر سنگھ آگیا۔ اس کے ہاتھ میں دونالی تھی۔

ایک بدمعاش نے کہا: "ارے بوڑھے۔ راستے سے ہٹ جا ورنہ کچلے جاؤ گے۔"

شیر سنگھ نے گرج کر کہا: "میں بوڑھا۔ شیر سنگھ بوڑھا۔ اپنے گھر والوں سے پوچھ کر آنا تھا کہ

سوتے گاؤں میں کوئی شیر سنگھ بھی رہتا ہے "

" شیر سنگھ ــــ لنگڑا شیر سنگھ "

سبھی بدمعاش قہقہے پر قہقہے لگاتے رہے ــ " بڑا آیا شیر سنگھ "

شیر سنگھ کا بس اتنا ہی سُننا تھا کہ وہ بپھر گیا ـــ اور گولی نکلی ــ ایک گولی، دوسری گولی تیسری گولی "

بہادر گاؤں کے کمینے بزدل اور ڈرپوک اس طرح بھاگے، جس طرح چور بھاگتا ہے۔

بعض مارے گئے۔ اور بعض ماؤں کی گودیوں میں جا کر چھُپ گئے۔

" شیر سنگھ ابھی زندہ ہے ـــ شیر سنگھ ابھی زندہ ہے "

سوتے گاؤں کے سارے لوگ نمبردار کے گھر جمع ہو گئے تھے ــ لیکن کسی کو شیر سنگھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک نے پوچھا۔

" نمبردار شیر سنگھ کہاں ہے "

دوسرے نے کہا۔

" شیر سنگھ کو ڈھونڈ لاؤ۔ وہی کوئی اُپائے سوچے گا۔"

تب نمبردار کی لڑکی آ گئی۔

" باپُو ـــ "

نمبردار نے کہا ـــ " بیٹی ـ تُم ـ آ گئیں "

" ہاں باپُو میں آ گئی ـ بابا شیر سنگھ نے مجھے بچا لیا " اور پھر نمبردار کی بیٹی رونے لگی۔

صُبح ہوئی تو سوتے گاؤں کے لوگوں نے دیکھا کہ شیر سنگھ دھرتی سے لپٹ کر بڑے آرام کی نیند سو رہا تھا۔

اور بندوق اس کی گود میں تھی، جیسے کوئی ننھا بچّہ سو رہا ہو ـــ ماں سے لپٹ کر ـــ اور ماں بھی خاموش تھی۔

اور بچّہ بھی ۔۔

اجیت کمار بخشی

"اُس کا اور میرا سچ"

شہنائیوں کی آواز کانوں میں پڑتے ہی وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا۔ اس کی حالت ایک ایسے انسان کی سی تھی۔ جس کی برسوں کی کمائی اُس کی آنکھوں کے سامنے لُٹی جائے اور وہ بے بسی کی حالت میں دیکھتا رہے اس کی ملتجی آنکھوں میں وحشت اور بے بسی کے ملے جلے تاثرات دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا کہ وہ سارے بند ٹوٹ جائیں گے۔ جو میں نے سیلاب روکنے کے لئے باندھ رکھے تھے میں گھبرا کر کمرے سے بھاگ کر بالکونی میں چلا آیا تھا۔

سیلاب واقعی اُمڈ پڑا تھا۔ چاروں طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ سارا محلہ روشنیوں میں نہایا گیا تھا۔ لوگوں کے شور و غل اور شہنائیوں کی چیخ و پکار نے مل کر ایک اذیت ناک کہرام مچا رکھا تھا۔ میرے اندر بڑے زوروں کی توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ شور و غل کا یہ سمندر میرے اندر کے خلاء سے اُمڈ رہا ہے اس خلاء سے جسے میں بے کاری کے زہر اور کے روتے بسورتے، ڈرے ڈرے، سہمے ہوئے نے عشق کی ناآسودگی سے پاٹنے کی پچھلے دو سال سے کوشش کر رہا تھا۔ بے کاری بھی کتنی اذیت ناک ہوتی ہے۔ کبھی کبھی انسان کو اپنا وجود بھی سڑانڈ دکھائی دینے لگتا ہے اور ہر چیز سے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ جس سے اپنے پن کی بُو بھی آتی ہو" یہ خلاء اب کیسے پُر ہو گا"؟

میرا سارا وجود ایک سوالیہ نشان بن کر میرے اندر سے اُمڈتے ہوئے سمندر میں ہچکولے کھانے لگا تھا۔

شہنائیاں چیخ رہی تھیں۔ اس کی ملتجی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی بے بسی وحشت بے طرح بھیگ گئی تھی۔ گلا رندھ گیا تھا اُس کا۔

"بھیّا یہ شہنائیاں بند کروا دو۔ آشا میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گی۔ یہ دو زندگیوں کا سوال ہے بھیّا۔"

خلاء کی تہہ میں بیٹھی ہوئی غلاظت سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے "سالے تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے

کچھ مہینے سے مکان کا کرایہ نہیں دے سکا۔ مالک مکان نے دھمکی دے دی ہے اور جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں اور اس پر یہ خوش فہمی، وہ تمہارے بغیر زندہ رہے گی اور خوب ٹھاٹھ سے زندہ رہے گی۔ شادی کے بعد اگر تمہیں پہچاننے کی بھی روادار ہوئی تو میرا نام بدل دینا۔"

میں غصّے سے ہانپ رہا تھا۔ سمندر میں کھلونے پڑے تھے اور ان کھلونوں میں مجھے گزشتہ دو سال کے سارے واقعات ڈوبتے ابھرتے دکھائی دے رہے تھے۔

"پریم جیون میں صرف ایک بار ہوتا ہے۔" اس کے سپاٹ چہرے، جھلکی ہوئی نظروں اور جذبات سے عاری لہجے نے بڑی شدّت سے چونکا دیا تھا۔

" ارے اس لڑکی کو تو لطیفے سے جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا" میں نے دل ہی دل میں کہا تھا۔ "پیار جیون میں صرف ایک ہی بار ہوتا ہے۔"

" پیار جیون میں دسں بار بھی ہو سکتا ہے میڈم۔ ہر بار ہم بڑے خلوص سے یہ سوچ سکتے ہیں کہ سچا پیار تو یہی ہے۔"

" آپ کی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

" یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم میری باتیں سمجھنا ہی نہیں چاہتیں۔ سچ اگر اتنی آسانی سے ہضم ہو جائے میڈم تو دنیا میں کوئی بھی زودگی نہ رہے۔"

ہم جب اپنے اپنے سچ سے نظریں چرانے لگتے ہیں تو پیار ہمارے لئے رہائی کا ذریعہ بننے کی بجائے زنجیر بن جاتا ہے۔ ایک ایسی زنجیر جس میں بندھے ہم تمام عمر ایڑیاں رگڑتے رہتے ہیں۔

" کوئی بات نہیں، لگا لیجئے جتنے دوش لگانے ہیں۔ ایک دن آپ بہت پچھتائیں گے۔ لیکن میں اُس دن یہاں نہیں ہوں گی۔"

" کیا اپنے سسرال چلی جاؤ گی۔"

" بند کرو یہ بکواس، یار تم اتنے سنکی کیوں ہو گئے ہو۔ آشا بھگوان کے لئے آنسو نہ بہاؤ۔ تمہارے یہ آنسو میری آتما پر انگارے بن کر برس رہے ہیں۔ اس کی باتوں کا برا نہ مناؤ۔ بے کاری نے اسے اتنا بددل کر دیا ہے کہ اس کا اپنے آپ پر سے بھی بھروسہ اٹھتا جا رہا ہے۔"

جذباتیت کی گندگی میں لتھڑا ہوا وہ مجھے بہت ہی بھدا لگا تھا۔ اور میں اپنے سچ کو تلاش کرنے کے لئے گندگی کے اس ڈھیر کو اتنی دیر تک کریدتا رہا تھا کہ مارے بدبو کے میرا دم گھٹ گیا تھا۔

آشا سے ہماری ملاقات آج سے دو سال پہلے ہوئی تھی۔ ان دنوں بے کاری کی دنیا میں نو وارد تھے

اس لئے ارمانوں کی کھیتی کو بڑے چاؤ سے سینچ رہے تھے۔

"میری آشا کے حسن میں ایک ایسا اُداس ترنم...... نہیں ایک...... ایک...... ہاں یہ زیادہ موزوں رہے گا، ایک ایسی مترنم اُداسی ہے جس کی مٹھاس روح کی گہرائیوں تک اُتر جاتی ہے۔ یار میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کیا ہے۔" مجھے اس کے جذباتی پنے پر بے اختیار ہنسی سی آگئی تھی۔ عورت کی قربت ہم کو کس قدر مضحکہ خیز بنا دیتی ہے۔ ایک مسکان، ایک ادا، اپنائیت کی لے میں ڈوبا ہوا ایک جملہ ہم پر ایسا ٹونا کر دیتا ہے کہ ہم اپنے تصورات کی ساری کائنات اس کے قدموں میں رکھ دیتے ہیں۔

آشا کی سب سے بڑی خوبصورتی یہ تھی کہ وہ لڑکی تھی اور اس کی زندگی میں داخل ہونے والی پہلی لڑکی تھی۔ دُبلی پتلی مریل سی لڑکی جس کے ضرورت سے زیادہ گھنے گھنگھرالے بالوں میں نظریں یوں اُلجھ کر رہ جاتی تھیں کہ اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ اگر کبھی کچھ دکھائی بھی دیتا تھا تو آنکھیں، جو ہمیشہ یوں جھکی ہوئی رہتی تھیں جیسے ایک انجانے پاپ کے بوجھ نے انہیں دبوچ رکھا ہو۔ ڈری ڈری، سہمی سہمی گٹھڑی سی بنی بیٹھی ہوئی۔ جب میں اسے دیکھتا تھا تو اکثر یہی سوچا کرتا تھا کہ اس بے چاری نے بھی کیا بکھیڑا مول لے لیا ہے۔

"یہ جھوٹ ہے۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ صرف تمہارے ڈر کے مارے اس کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ وہ صرف تم سے ڈرتی تھی، تم، جو میرا وہ روپ ہو جس سے مجھے نفرت ہے۔" جذبات کی شدت سے اس کی آواز یوں کانپ رہی تھی جیسے شیشے میں بال پڑ گئے ہوں۔ مجھے اپنے گلے میں خراش سی محسوس ہونے لگی تھی۔

"اگر تم نہ ہوتے تو یہ سیلاب کبھی نہ آتا۔" الفاظ اس کے حلق سے پھنس پھنس جاتے تھے۔

"واقعی یہ سیلاب کبھی نہ آتا۔ چھ مہینے کا کرایہ بھی ادا ہو گیا ہوتا۔ نوکری بھی مل گئی ہوتی۔ اور تم دونوں بانہوں میں بانہیں ڈالے دنیا جہان کی فکروں سے آزاد سیر سپاٹے کیا کرتے۔ یار تمہیں عقل کب آئے گی۔" مجھے غصہ آ گیا تھا لیکن شہنائیوں کی آواز نے مجھے پھر خیالات کے اُسی ڈھرے پر لا کھڑا کر دیا۔

مکان کا کرایہ گزشتہ دو مہینے سے ادا نہیں ہوا تھا۔ آشا میرے کمرے میں کھڑی تھی اور وہ بُت سا بنا اُسے گھورے جا رہا تھا۔ جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ کافی عرصہ تک دونوں اسی عالم میں کھڑے رہے تھے۔ پھر اس کی آنکھیں ڈھلنے لگی تھیں۔ کئی دنوں کے انتظار کی کالک اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہی تھی۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ وقت کی گردش تھم گئی ہے۔ جلد ہی یہ طلسم ٹوٹ گیا۔

"بسنتی جیسی سہیلی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ ہم دونوں نے آج پکچر کا پروگرام بنایا ہے۔ آپ بھی چلیں گے نا۔"

"بسنتی کا بچہ بڑا سویٹ ہے۔ گدھے نے پیشاب کر دیا آج مجھ پر ساری ایسی تیسی ہو گئی۔"

" بسنتی کے ہز بنڈ ....."

" میڈم بھاڑ میں گئی تمہاری بسنتی ہز بنڈ اور بچے سنت" میں آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ اتنے دن انتظار کروا تے کے بعد آج آئی ہو تو آتے ہی بسنتی کا قصہ لے بیٹھی ہو۔ انہ تو تمہاری سہیلی سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ اس کے بچّے سے۔ آئی ہو تو دو پیار کی باتیں ہی کر ڈالو کہ کمبخت کو اگلی ملاقات تک زندہ رہنے کے لئے کوئی بہانہ تو مل جائے"۔

آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں، بچپن کی سہیلی بھی کو چھوڑ دوں"۔

" وہ تو ایک دن چھوڑنا ہی پڑیں گے"۔

" آشا اس کی باتوں پہ دھیان نہ دینا۔ یہ خود غرض کمینہ میرا بیری ہے۔ یہ ہمارے پیار کا دشمن ہے یہ شیطان ہے۔ اس کا مقصد ہمیں ورغلانہ ہے۔ آشا ابھی مت جاؤ۔ بھگوان کے لئے ابھی مت جاؤ آشا۔ تم چاہے جیسی مرضی باتیں کرو۔ میرے سامنے بیٹھ کر بس باتیں کرتی رہو۔ تمہاری آواز کا شہد تو میرے کانوں میں ٹپکتا رہے گا۔ تمہاری خوشبو تو میرے دماغ کو معطر کرتی رہے گی۔

آشا میرے سامنے کھڑی تھی حسب معمول نظریں جھکائے ہوئے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جس گناہ کی سزا وہ بھگت رہی ہے۔ اور اصل میرا وجود ہی وہ گُناہ ہے۔ شرمندگی کے احساس سے بچنے کے لئے میں کھڑکیاں کھولنے لگا تھا۔

" بھگوان کے لئے کھڑکیاں نہ کھولئے کوئی دیکھ لے گا۔

" دیکھ لے گا تو کیا بگاڑے گا ہمارا"؟

" آپ کا بھلے ہی کچھ نہ بگڑے مگر میں لڑکی ہوں"۔

" آشا کیا تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ ایک بار اگر مجھ سے نظریں ملا کر ہاں کہہ دو تو میں یہ کھڑکیاں زندگی بھر نہیں کھولوں گا۔

" ہاں کہہ دو آشا۔ پیار کرنا کوئی پاپ نہیں ہے"۔

" کیا پیار کرنا پاپ ہے"؟

" آشا میں خاموشی نہیں اپنے سوالوں کا جواب چاہتا ہوں"۔

" اگر پیار کرنا پاپ ہے تو بتاؤ تم یہاں کیوں آتی ہو"؟

" بھگوان کے لئے کھڑکیاں نہ کھولئے"۔

" کھڑکیاں ضرور کھلیں گی۔ تمہیں ڈر لگتا ہے تو چلی جاؤ"!

" بھگا دیا نا۔ اتنے دنوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ اور جی بہلاوے کی دو باتیں بھی نہ ہو سکیں۔ بھیا میں نے

تمہارا ایسا کیا بگاڑا ہے۔ جو یوں بدلہ لے رہے ہو۔ مجھ پر نہیں تو اُس کے آنسوؤں پر تو ترس کھایا ہوتا۔ اپنی پریشانیوں
کا زہر اگلنا ہی ہوتا ہے تو مجھ پر اُگل لیا کرو۔ اس غریب پر کیوں جبر کرتے ہو؟"

"یار دیا کبھی مجھے اس عقل کے اندھے سے نجات ملے گی۔ میاں میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ مکان
کا کرایہ پچھلے تین ماہ سے نہیں چکایا جا سکا۔ بے کاری کا یہ عالم ہے کہ کپڑوں میں پیوند لگنے شروع ہو گئے ہیں اور اس
پر تم بھی نصیحتوں کی لٹھ لئے آٹھوں پہر گردن پر سوار رہتے ہو۔ جاؤ منا لاؤ اسے منت سماجت کر کے۔ میں آئندہ کبھی زبان
نہیں کھولوں گا۔" مجھے اپنی بے بسی اور اس کی بے چارگی پر رونا سا آ گیا تھا۔

"کہیے کوئی سلسلہ بنا نوکری کا؟"

"اُمید ہے اس مہینے مل جائے گی۔ تشریف رکھیے نا۔ دیکھیے لالہ جی میں کافی شرمندہ ہوں کہ گزشتہ
پانچ سے کرایہ ادا نہیں کر سکا۔ خیر جہاں اتنا انتظار کیا ہے تھوڑی دیر اور صبر کر لیجئے۔ میں نوکری ملتے ہی
آپ کی پائی پائی......؟"

"کرائے کی کوئی بات نہیں۔ آپ کہیں بھاگے تھوڑے ہی جا رہے ہیں۔ میں دراصل ایک اور بات کے سلسلے
میں آپ سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔"

"فرمائیے۔"

"یہ ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی یہاں کس سلسلے میں آتی ہے؟"

"بات دراصل یہ ہے لالہ جی کہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور ارادہ یہ ہے کہ نوکری ملتے ہی...."

"خیر وہ تو آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں آپ کو اپنا سمجھ کر یہ بات کہہ رہا ہوں کہ یہ شریفوں کا محلہ ہے
اس لئے ہم [illegible] نہیں دیکھ سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ میں
آپ کو سمجھا دوں [illegible] اور عنقریب ہی اس کی شادی کرنے والے ہیں۔ اس
[illegible]"

"لیکن [illegible] آشا کسی اور کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار
[illegible]؟"

"[illegible] اور پھر شریف گھرانوں کی بیٹیاں اتنی منہ پھٹ بھی تو نہیں ہوتیں کہ والدین
کے منہ لگیں۔ والدین ہمیشہ اولاد کی بہتری ہی سوچتے ہیں۔"

"لیکن یہ تو ظلم ہوگا لالہ جی۔ آپ ڈاکٹر صاحب سے کہہ کیوں نہیں دیتے کہ آشا کسی سے محبت کرتی
ہے"

"کبھی ڈاکٹر صاحب ذات برادری والے آدمی ہیں۔ شہر میں ان کا نام ہے۔ عزت ہے۔ وہ برادری کو کیا منہ دکھائیں گے؟"

"تو کیا برادری کو خوش کرنے کے لیے ایک معصوم کے جذبات کا خون کر دیں گے وہ؟"

"دیکھئے آپ ابھی نوجوان ہیں۔ اس لئے ہر چیز کو جذبات کے پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ جب ہماری عمر کو پہنچیں گے تو یہ باتیں سمجھ میں آئیں گی۔ اچھا میں جاتا ہوں۔ لیکن میں نے جو بات کہی ہے۔ اُسے بھولئے گا نہیں ورنہ میں مجبور ہو جاؤں گا؟"

میرا جی متلانے لگا تھا۔ کمرے میں چاروں طرف بدبو کے بھبکے اڑ رہے تھے۔ مارے گھٹن کے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔ تازہ ہوا حاصل کرنے کے لئے باہر کی طرف لپکا۔ لیکن دروازے ہی میں بدبو کے ایک بہت بڑے غبارے ٹکرا کر بے ہوش سا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے اس کی بدصورتی پر رحم سا آ گیا تھا۔

"بیٹا میں ذات برادری والا آدمی ہوں۔ میری ناک نہ کاٹو۔ میں ساری عمر تمہارا احسان مند رہوں گا؟"

"بھگوان کے لئے یہاں سے چلے جاؤ" مارے بدبو کے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔"

"بھیا اب کیا ہو گا؟"

"ہو گا یہ کہ میرے دماغ کی چندیاں بکھر جائیں گی۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے اپنے سبھی ستانے والوں کو وہ چرکے لگاؤں گا، وہ چرکے لگاؤں گا کہ ساری عمر گھاؤ سہلاتے ہی گزرے گی۔ میں ایک جیتا جاگتا انسان ہوں، کوئی پتھر تو نہیں ہوں کہ جس کا جی چاہے ٹھوکر مارتا چلا جائے؟"

"اتنے سنگدل نہ بنو۔ مجھ پر نہیں تو آشا پر ہی ترس کھاؤ۔ کتنا بھروسہ ہے اُسے تم پر؟"

"یار داب ساری دنیا پر ترس کھانے کے لئے کیا میں ہی رہ گیا ہوں۔ ڈاکٹر پر ترس کھاؤں تاکہ برادری میں اُس کی ناک اونچی رہے اور لوگ بانگ داد دیں کہ کس شان سے بیٹی کا بیاہ رچایا ہے۔ آشا پر ترس کھاؤں کہ ایک پڑھی لکھی، بالغ لڑکی ہوتے ہوئے بھی پیار کسی کے ساتھ کرتی رہی اور ڈولی میں بیٹھ کر کسی اور کے ساتھ چلی جائے گی۔ فرضی مجبوریوں کا بہانا بنا کر ... تاکہ اس کے باپ کی جھوٹی عزت و شان بنی رہے۔ تم پر ترس کھاؤں تاکہ تم ہمیشہ جذباتیت کی غلاظت پھیلاتے رہو اور میرا دماغ تمام عمر ایک ناسور کی طرح رستا رہے۔ کیا دیا ہے تم لوگوں نے مجھے جو مجھ سے اس کی توقع رکھتے ہو۔ مجھ پر کوئی ترس نہیں کھاتا۔ میں غصے سے لال پیلا ہو گیا تھا۔"

بڑا مالک مکان بنا پھرتا ہے سالا کہیں کا؟"

"یہ سب تمہاری پھیلائی ہوئی گندگی کا اثر ہے کہ وہ موٹی توند اور گنجی چاند والا بنیا بھی آج مجھ پر ناک بھوں چڑھاتا رہا۔ اور میں بے بسی کے عالم میں کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ دُھول نہ جمادی ہوتی سُسرے کی گنجی چاند پہ

ایک۔"

وہ ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ "کچھ کرو بھیا"۔ "ہاں ضرور کروں گا۔" ایسی صفائی کروں گا اب کے تمہاری کہ اب کی بار جو کوئی بھی ناک سکوڑے گا، اپنی کھوپڑی سہلاتا ہوا نظر آئے گا۔

آشا میرے سامنے کھڑی تھی۔ حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ افسوس کرنے آئی ہے۔

"کیا تم پر بھی ترس کھاؤں؟ جاری کرو اپنی مجبوریوں کی کہانی۔"

"بھگوان کے لئے کچھ کیجئے۔ ورنہ اس گھر سے ڈولی کی جگہ میری ارتھی اٹھے گی۔"

"اب تو یہ عتراض چھوڑو آشا۔ بس تھوڑا سا دھیرج رکھو۔ صرف ایک بار نظریں اٹھاؤ۔ بس تھوڑی سی ہمت کرو۔ دیکھو ہم اپنے اپنے سچ کے اس قدر نزدیک آگئے ہیں کہ ایک ہی نظر میں اسے پہچان لیں گے۔ صرف ایک بار نظریں اٹھا کر دیکھو۔ پھر کوئی دیوار تمہاری راہ میں حائل نہیں رہے گی۔"

بھیا کچھ کرو۔ دیکھو بے چاری کس بے بسی سے آنسو بہا رہی ہے۔"

"آشا آؤ بھاگ چلیں۔ کہیں دور ایک ایسے دیس میں جہاں کوئی بھی جھوٹی عزت و شان کا واسطہ دے کر تمہیں تمہارے ارمانوں کا خون کرنے پر مجبور نہ کرے۔ جہاں تمہاری جھکی ہوئی نظر مجھے اپنے گناہ کا احساس دلانے کی بجائے میرے روئیں روئیں۔ پور پور میں ایک دھیمی دھیمی سی آنچ سلگا دیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ایسا کبھی بھی نہیں کر سکوں گی۔ ماں باپ کے نام پر کالک لگانے سے پہلے ہی میں اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ دوں گی۔" اس کی آواز حلق میں پھنس گئی تھی۔

"تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔"

آواز حلق میں اٹک گئی تھی

"تو پھر میری مبارک باد پیشگی ہی قبول کرو۔ شائد پھر کبھی موقع نہ ملے۔"

آشا بھگوان کے لئے رک جاؤ۔ اپنے آپ پہ اتنا بڑا ظلم نہ کرو۔ اتنا بھیانک جھوٹ نہ بولو اپنے ساتھ۔ دیکھو تمہارے آنسو اس فیصلے کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔ تمہارے قدموں کی لڑکھڑاہٹ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ تم اپنے اس فیصلے پر ثابت قدم نہ رہ سکو گی۔ آشا رک جاؤ۔ رک جاؤ آشا، بھیا اسے روکو۔ ان قدموں وہ کسی غیر کے ساتھ نہ جا سکے گی۔

"بس اب چپ ہو جاؤ۔"

"میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ ہائے کیسے برداشت کرے گی وہ زندگی کے سفر کی صعوبتیں کسی غیر کے ساتھ۔"

"اماں اب چپ بھی ہو چکو۔ ورنہ پھر مجھے ہی چپ کرانا پڑے گا۔ بے کار کی رٹ لگا رکھی ہے۔ چند لمحوں

کا ساتھ کیا ملا کہ اپنی اصلیت تک کو بھی فراموش کر دیا۔"

یہاں کوئی کسی کا آشنا نہیں۔ ہم سب اپنی اپنی صلیب پر تنہا ٹنگے اپنے سچ کو تلاش کر رہے ہیں۔ سچ جو کبھی ایک ارتھی یا کسی کوڑھی کی شکل میں مل جاتا ہے تو ہم پر آسمانی کے اسرار کھل جاتے ہیں اور کبھی آشا کی شکل میں دیکھا دیکھتا ہے تو ہم خود ہی ایک ایسی چلتی پھرتی لاش بن جاتے ہیں جسے جھوٹے جذبات اور ناحاصل امیدوں کے کوڑھ نے اس قدر گھناؤنا بنا دیا ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ یہ نفرت ہمیں خود غرضی، کمینگی، غرور، لالچ اور ظلم سکھاتی ہے اور ہم اس دُنیا کے سچے انسان بن جاتے ہیں۔ اور اپنی جھوٹی عزت و شان کو برقرار رکھنے کے لئے کسی کے ارمانوں کا خون تک کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

اوشا جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے دہشت اور بے بسی کے اثرات ڈھل گئے تھے۔ اُس کی پتھرائی ہوئی بے نور آنکھوں میں اب کوئی التجا، کوئی خواہش، کوئی جستجو نہیں تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک ایسا سکون تھا۔ جو محرومیوں کی حدوں سے اس پار رہنے والے لوگوں کے چہروں پر ہوتا ہو گا۔ کاش آشا اُسے ایک نظر دیکھ لیتی۔ مجھے پہلی بار اپنائیت کے احساس میں لُطف سا ملنے لگا تھا۔ میں نے اس لطف کو دائمی بنانے کے لئے اس کی لاش کو بڑے خلوص و محبت کے ساتھ اُٹھا کر اس سمندر میں پھینک دیا تھا جو میرے اندر کی خلاء سے اُمڈ رہا تھا۔

میں بالکونی میں اب تنہا کھڑا تھا۔ شہنائیوں کی چیخ و پکار اور لوگوں کا شور و غل اب آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ میرے اندر کے خلاء سے اُمڈا ہوا سمندر دھیرے دھیرے شانت ہو گیا تھا۔ اور سطح آب پر اس کی لاش تیر رہی تھی۔ میرا سچ مجھے مل گیا تھا۔ سچ جو اس کی لاش اور میری طرح تنہا تھا۔

اور مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میں ساری فکروں سے آزاد ہو گیا ہوں۔ ایک بہت بڑا بوجھ میرے سر سے اُتر گیا ہے۔ مجھے پہلی بار مکمل رہائی کا احساس ہوا تھا۔ رہائی جو سچ تھی۔ اس کا اور میرا سچ۔

کلدیپ رعنا

"ایک خط، ایک گیت"

رات کس قدر اُداس اور تاریک ہے۔

برف کے گالے گر رہے ہیں

چھت ٹپک رہی ہے

اور دُور کسی جگہ کوئی کتا رو رہا ہے

وُوں، وُوں ——— ٹپ، ٹپ

ٹپ، ٹپ ——— وُوں، وُوں

میرے سینے میں درد سا اُٹھ رہا ہے، دل میں ایک ٹیس سی کروٹ لے رہی ہے۔

اُف! یہ اُداسی اور تاریک رات، خاموش اور تنہا رات ———

ایسے میں کوئی آئے: آکر کوئی گیت گنگنائے، کوئی اُداس سا، روتا سِسکتا سا گیت

گیت ——— !؟

کوئی کے سارے وجود میں درد و کرب کی ایک لہر دوڑ گئی۔

مجھ سے میرے گیتوں کی رانی رُوٹھ چکی ہے، ———

اب میں کوئی گیت نہیں لکھ سکتا، گوئی گیت نہیں گا سکتا۔

رات کی اُداسی بڑھ گئی، تاریکی بڑھ گئی۔ اور میری پلکیں بھیگ گئیں ———

کوئی! ——— آج میں بہت اُداس ہوں، مجھے اور اُداس نہ کرو۔

ہاں، ہاں ——— آج رات بھی اُداس ہے، تاریکیاں بھی اداس ہیں اور میں بھی اُداس ہوں، ایسے میں ——— ایسے میں میں ایک خط لکھ دوں گا اپنے گیتوں کی روٹھی رانی کو ——— !

مجھے اپنے دل میں کوئی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں کراہ اُٹھا ———

وہ کون ——— !؟

کوی بیقرار سا ہوا ـــ

اپنے گیتوں کی رانی کو نہیں جانتے !؟ اپنی منزل، اپنے پیار کو نہیں جانتے !؟ ریحانہ کو تو جانتے ہونا؟

ریحانہ ـــ !؟ ریحانہ نام ہے ایک پھول کا!

ایک پھول جیسی لڑکی کا ـــ

کوی کی بیقراری کو قرار سا آیا ـــ

رات کے اندھیرے رک گئے، اُداسی رُک گئی۔

ایک لمحہ ـــ

ایک نازک لڑکی ـــ

البیلی، شرمیلی ـــ

حساس، جذباتی ـــ

رونے والی، رلانے والی ـــ

دوسرا لمحہ ـــ !!

دوں، دوں ـــ ٹپ، ٹپ

اُف! یہ اُداس اور تاریک رات! ایسے میں ـــ

ـــ ایسے میں میں ایک خط لکھ دوں گا اپنے گیتوں کی روٹھی رانی کو

لیکن یہ میری اُداسی ـــ مجھے ایک گیت چاہیئے کوی!

"گیت نہیں، خط" ـــ کوی نے قلم تھام لیا۔

میں اُداس ہوا، بہت اُداس ـــ

اور وہ کاغذ پہ جُھک گیا

"میرے گیتوں کی رانی!

مجھ سے میرا سب کچھ ـــ"

کوی! کوی ـــ مجھے تمہارا ایک گیت یاد آیا ہے ـــ ایک پیارا سا بھولا بسرا گیت!

کوی کا قلم رُک گیا ـــ اور میں اپنے لہجے میں دل کا سارا درد سمو کر گیت گنگنانے لگا ـــ

ہلکا سا اک سپنا ہوں میں،

ٹوٹا سا اک تارا ہوں میں۔

مجھ سے میرے گیت لے لو

مجھ کو اپنا پیار دے دو

کوی کے اندر کوئی پرانا سا زخم رسنے لگا اور میرے ہونٹ کانپنے لگے —

" بولو — جواب تو دو — ہاں، یا" نہیں، ؟"

" میں کچھ نہیں کہہ سکتی !"

" تم سب کچھ کہہ سکتی ہو !"

" نہیں، نہیں — تم نہیں چاہتے ہو کہ میں یہاں بیٹھوں"

" دل وجان سے چاہتا ہوں !"

" تو پھر یہ غیر سنجیدگی — !؟"

" میں قطعی سنجیدہ ہوں !"

" تو میں جارہی ہوں —"

" تم جا سکتی ہو — لیکن تمہارے جانے کا مطلب" نہیں" ہوگا"

ایک جھنکار — !!

گیتوں کی رانی رک گئی — نظریں جھک گئیں

اور چند لمحے سرک گئے —

" ریحانہ — !" کوی اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا

" کہو — یا !؟" بادل برسنے لگے، رونے والی رونے لگی

" روؤ نہیں —"

" کیوں رلاتے ہو ؟ — کیوں ؟ —"

اور پھر بادل دیر تک برستے رہے۔ اور دھرتی کی پیاس بجھتی رہی —

رات آئی، اُجلی سی، بھیگی سی رات —

کوی کے دل میں ایک میٹھا میٹھا سا درد اٹھنے لگا، اس نے قلم تھام لیا اور ایک گیت لکھا اپنے گیتوں کی رانی کے لئے —

لیکن گیتوں کی رانی اسے دوسرے دن ملی نہیں

تیسرے دن، چوتھے دن، پانچویں دن بھی نہیں۔

کوی بیقرار ہوا۔ میں بے چین ——

اور چھٹے دن میں اُس کے گھر گیا —— وہاں اُس کے بغیر کوئی نہ تھا!

اس نے مجھے کھڑکی کے شیشوں سے آتے ہوئے دیکھا۔

اور جب میں سیڑھیاں پار کر کے اوپر والی منزل پر آیا تو وہ اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔

میں رُک گیا —— اور اُس نے آگے بڑھ کر میرا لرزتا کانپتا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا

"چلو —— !" ایک سرگوشی

"اتنے دنوں کہاں رہیں ؟" کپکپایا لہجہ

"اندر تو چلو ——" دوسری سرگوشی

میں اندر آیا ——

"کل آؤ گی نا ——؟" کوی اپنے آنسو روک نہ سکا

"ہاں —— ہاں —— آؤں گی" وہ مسکرائی، ایسے جیسے روئی

دونوں ایک دوسرے آمنے سامنے، ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، کرسیوں پر بیٹھے!

"مجھے میرے احساسِ تنہائی نے مار دیا ہے ریحی! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے —— اب —— جیسے میں اکیلا ہوں، جیسے میرا کوئی نہیں —— انسان ہی تو ہوں آخر —— چاہتا ہوں کہ مجھ سے بھی کوئی پیار کرے، —— مجھے بھی کوئی اپنا سمجھے —— اور —— اور —— تم ——" اور اُس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پھر اپنا پرانا سوال دوہرایا —— "تم مجھ سے پیار کرتی ہو نا؟"

ریحانہ کی پلکیں بھیگ گئیں، ہونٹوں کے کونے پھڑپھڑانے لگے ——

"کیوں پوچھتے ہو؟ —— کیوں رلاتے ہو؟ —— کیوں؟ کیوں؟"

کوی کے ہونٹوں پر ایک درد بھری مُسکان پھیل گئی —— اور وہ دھیمے دھیمے لہجے میں گنگنانے لگا...

مجھ سے میرے گیت لے لو۔

مجھ کو اپنا پیار دے دو......

جانے کتنا وقت گذر گیا ——

دُور کسی جگہ گھنٹہ گھر نے رات کے آٹھ بجائے

گیت رُک گیا

آسمان کی وسعتوں میں ایک تارا ٹوٹ کر گر گیا۔

روشنی کی ایک لمبی ٹیڑھی لیکر کسی صورت میں تبدیل ہوگئی ۔ کچھ دھندلی، کچھ صاف

سلیمہ !۔ سلیمہ !!

میری آنکھیں پتھرا گئیں

نہیں !۔ نہیں !!۔ نہیں !!!

کوی کراہ اٹھا

میں نے کوی کی گردن مروڑ لی اور کھڑا ہوا۔

" میں جاؤں گا ۔"

" ابھی ۔ !؟" ریحانہ کے لہجے میں افسردگی تھی

دُور کسی جگہ سلیمہ باہیں پسارے کھڑی تھی

" ہاں ۔ ابھی !"

کوی پھڑپھڑانے لگا، لیکن میرے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوئی

اور میں دروازے سے باہر آیا ۔

ایک لمحہ ۔ !

میں نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے پلٹ کر دیکھا ۔ گیتوں کی رانی دروازے میں کھڑی تھی۔

میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی

" جاؤں ۔ !؟" کوی کا گھٹا گھٹا لہجہ

" نہیں ۔ !!!" اُس کے لہجے میں جذبات تھے، دعوت تھی، حکم تھا۔

میرا سارا بدن ڈھیلا پڑ گیا ۔ اور دوسرے ہی لمحہ گیتوں کی رانی میری گود میں تڑپ رہی تھی !!

دوں، دوں ۔ ٹپ ٹپ !

اُف ! یہ اُداس اور تاریک رات

میرا انگ انگ کسی آگ میں جل رہا ہے۔ کوی !۔ کوی ! مجھے ایک گیت سنا دے، میرے لئے ایک گیت لکھو، اداس سا، روتا بکھرتا سا گیت

گیت ۔ !؟

کوی کے دل میں ایک انگارا سا دہک اُٹھا۔

مجھ سے میرے گیتوں کی رانی روٹھ چکی ہے۔

اب میں ——— وہ خطا پر جھک گیا!

میرے دل کا درد بڑھ گیا [illegible] تیز ہوئی

سلیمہ بھی تو ایک لڑکی ہے — وہ بھی تو گیتوں کی رانی بن سکتی ہے۔

کوی نے اپنے پنکھ پھیلائے

ہاں، ہاں — سلیمہ بھی ایک لڑکی ہے، ایک عام سی، بہلنے، پھسلنے والی لڑکی،

وہ بہل گئی — میں بہل گیا۔

وہ پھسل گئی۔ میں پھسل گیا

نہیں، نہیں — وہ میرے گیتوں کی رانی نہیں — میرے گیتوں کی رانی!!؟

مانسبل جھیل کے کنارے، ریسٹ ہاؤس کے دائیں طرف کوئی سو گز کے فاصلے پر ایک چنار کا درخت ہے: پھیلا ہوا، اُلجھا ہوا۔ اس کی ایک شاخ جھیل کی سمت پھیلی ہوئی ہے، اسی شاخ پر کوی اور ریحانہ بیٹھے ہیں — اور کوی ریحانہ سے کہہ رہا ہے۔

"تم میرے گیتوں کی رانی ہو!"

ریحانہ کے ہونٹ کپکپانے لگتے ہیں —

"اور سلیمہ —!؟"

میں کوی کو دبوچ لیتا ہوں —

"کچھ بھی تو نہیں۔"

"لیکن —!؟"

کوی مچلنے لگتا ہے، لیکن میری گرفت مضبوط ہو جاتی ہے

"لیکن کیا —!؟ اگر کوئی لڑکی مجھ سے پیار کرے اور میں اس کے پیار کی قدر کروں تو اس میں کیا کوئی برائی ہے؟"

وہ اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالے مسکراتی ہے — ایسے جیسی روتی ہو

"میرا پیار...." اس کا لہجہ گلوگیر ہو جاتا ہے، آنکھوں سے بے چینی ٹپکنے لگتی ہے۔ "میرے پیار کی توہین نہ کرنا۔" اور میرے شانوں پہ سر رکھ کر رونے لگتی ہے!

پھسلتے پھسلتے سنبھلنا ایک بڑی بات ہے

بڑی باتیں بڑے آدمیوں سے سرزد ہوتی ہیں۔

میں بڑا آدمی کہاں — !؟ پھسلتے پھسلتے گر گیا۔

سلیمہ پوز دے رہی تھی اور میں کیمرہ آنکھ سے لگائے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ریحانہ مسکراتی ہوئی آئی اور سلیمہ کے ساتھ لگی جا کھڑی ہوئی، سلیمہ نے ایک حقارت سے بھرپور نظر اس پر ڈالی اور نفرت سے کندھے جھٹک دیئے، میں بھی ضبط نہ کر سکا —

"ریحانہ ! ہٹو بھی — کیا کر رہی ہو !؟" میرا لہجہ بے حد جھنجلایا ہوا تھا۔

ریحانہ نے میری طرف دیکھا، عجیب انداز سے، عجیب نظروں سے اور پھر مسکراتی ہوئی شائد روتی ہوئی وہاں سے چلی گئی —

بہت ساری تصویریں کھینچ کر سلیمہ مچل گئی کہ اہر بل آبشار پہ بھی ایک پوز لیا جائے — آبشار پہ جانا بھی ایک مسئلہ تھا، چٹانوں اور جھاڑیوں کو سر کرتے ہوئے ایک گہری کھائی میں اترنا — میں نے سلیمہ کو تھام لیا اور جھاڑیوں اور چٹانوں کا سہارا لیتے ہوئے ہم نیچے اتر آئے،

سلیمہ نے کیمرہ فٹ کیا اور دوڑتی ہوئی آ کر میری گردن میں باہیں ڈال دیں۔

تصویر کھینچ گئی اور میں نے آبشار کی طرف دیکھا — وہاں ریحانہ کھڑی تھی !

میں ایک بار پھر جھنجلایا — اور سلیمہ کا ہاتھ تھامے اوپر آ گیا۔

اوپر آ کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو ریحانہ کی دھندلی سی شبیہہ مجھے بدستور اپنی جگہ کھڑی اہر بل کنڈ کو گھورتی ہوئی نظر آئی۔

آبشار گرج رہا تھا — تیزی و تندی کے ساتھ ! میں نے زور سے سلیمہ کا ہاتھ دبایا

کوئی تلملایا — بڑا آدمی تھا تو ٹکتا رہا

لیکن پھسلتے پھسلتے گرنے میں جو مزہ ہے — اس سے ایک چھوٹا آدمی منہ کیوں موڑے

میں نے کوئی کو دبوچ لیا، پوری سختی سے، پوری مضبوطی سے اور خود بہک گیا — بہکتا رہا۔

دوپہر کا وقت تھا، ہم تھکے ہارے ریسٹ ہاؤس میں بیٹھے تھے، ریحانہ آئی اور میرے قریب آ کر ٹفن کا ڈبہ کھول کر میرے لئے کھانا پروسا۔

"کھانا — !" اس کا لہجہ ڈوبا ہوا تھا۔

کوئی کے دل پر گھونسہ سا آیا — وہ تڑپ اٹھا۔

میں ہاتھ بڑھانے ہی لگا تھا کہ سلیمہ بول پڑی "— ہم کھا چکے — !"

مجھے سلیمہ پر بہت غصہ آیا — لیکن سلیمہ میری کمزوری تھی، کچھ کہہ نہ سکا۔

ریحانہ نے خاموشی سے ڈبہ بند کیا ــــ اور دھیرے سے مُسکرا کر یا شاید رو کر چلی گئی

کھوتے کھوتے، بہکتے بہکتے، گرتے گرتے جب میں سنبھلا ــــ تو

'ریحانہ سوکھتی جا رہی ہے'

'ریحانہ بیمار ہے'

'ریحانہ کو دورے پڑتے ہیں'

'ریحانہ کو دل کی بیماری لگی ہے'

'ریحانہ نے یونی ورسٹی چھوڑ دی ــــ!'

نہیں ــــ نہیں ــــ نہیں۔

کوی پر بجلی سی گر پڑی، پہاڑ سا ٹوٹ پڑا ــــ

ریحانہ روتی مسکراتی، مُسکراتی روتی، انجان سی، اجنبی سی۔ خیالوں میں گُم، سپنوں میں کھوئی ہوئی بیٹھی تھی۔

کوی دوڑا دوڑا آیا ــــ اور اُس کی گود میں گر پڑا

اُس کی لمبی لمبی، مخروطی اُنگلیاں کوی کے سر کو سہلانے لگیں۔

"گیتوں کی رانی! ــــ میرے گیتوں کی رانی!!"

کوی کی آواز سُنتے ہی ریحانہ کو جیسے کسی سانپ نے کاٹا، وہ لڑکھڑا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ زرد پڑا، سارا جسم لرزنے لگا۔ اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام لیا ــــ

کوی نے سہارا دینے کے لئے بازو پھیلائے۔

"نہیں ــ نہیں ــ" وہ لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور کانپتے ہوئے لہجے میں کہنے لگی "مجھے ہاتھ نہیں لگاؤ ــــ مجھے نہیں چھوؤ ــــ میں ــ میں ــ بہت گندی ہوں ــــ میرا پیار گندہ ہے ــــ [illegible] کے پہاڑوں سے بھی بلند ــــ اور اس کنٹرے سے بھی گہرا ــــ میں اس کا [illegible] برداشت نہیں کر سکتی ــــ جاؤ ــــ جاؤ ــــ اپنی سلیمہ کے پاس جاؤ ــــ"

کھوتے کھوتے، بہکتے بہکتے، گرتے گرتے جب یہ سنبھلا تو گیتوں کا [illegible] ــــ [illegible] کا روح پیاسی تھی!

چند دنوں کے بعد میں نے سُنا کہ ریحانہ کو کالج سے [illegible] گیا۔

ایک جلتی ہوئی سلاخ میرے دل کے نہاں خانوں میں اُترتی چلی گئی۔

اور بہت دنوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے زخم بہت گہرے ہو چکے ہیں۔

تب میں نے گیت لکھنے چاہے لیکن لکھ نہ سکا

گیتوں کی رانی کو خط لکھنا چاہا، لیکن لکھ نہ سکا ——

اور ایک عرصہ گذر گیا ——

دول، دول، — ٹپ، ٹپ

اُف! — یہ اُداس اور تاریک رات

ایسے میں ——

کوئی! — آج میرے اندر کے زخم رسنے لگے ہیں، میرا انگ انگ درد سے تڑپ رہا ہے،
ایک عرصے کے بعد آج میں نے ریحانہ کو دیکھا — آج مجھے ایک گیت چاہیئے، اُداس سا، روتا بلکھتا گیت۔

مجھ سے میرے گیتوں کی رانی روٹھ چکی ہے ——

روٹھی رانی کو منانا ہوگا کوئی — تمہارے گیتوں کی خاطر، تمہارے پیار، تمہاری محبت کی خاطر۔

اُٹھو تم خط لکھ دو — میں تمہارا خط پہنچا دوں گا۔ تمہارے گیتوں کی رانی تک!

ابھی ابھی — مجھے اپنی ریحانہ سے ملنا ہے، اپنی منزل، اپنے پیار سے ملنا ہے۔

لیکن آج پہلی بار میرا دل اُس سے ملنے سے گھبرا رہا ہے — جانے کیوں؟

میں انسان ہوں ریحانہ! مجھ میں خامیاں بھی ہیں، کمزوریاں بھی، میں بہک گیا، پھسل گیا، لیکن تم تو رانی ہو، رانی معاف کرتی ہے — میری رانی! روٹھی رانی بس ایک بار مجھے معاف کرو —— خط میری جیب میں تھا!

اور میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا

جب میں اوپر والی منزل پر آیا تو میرے دل میں ایک ٹیس سی اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

آج کوئی دروازے میں کھڑا نہیں تھا۔

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی — دروازہ کھُلا گیا اور میرا کانپتا ہوا ہاتھ ماتھے کی طرف چلا گیا۔

" اوہ آپ !۔۔۔ میں تو ابھی آپ ہی کے ہاں آنے والی تھی !"

کوئی کو اس کا یہ لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔ لیکن میرے مردہ دل میں زندگی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی اور وہ مسکراکر اندر آگیا۔

" اب کیا حال ہے ؟" چند لمحوں کے بعد میں نے پوچھا

" اچھی بھلی تو ہوں ۔۔۔"

وہ مسکرائی ۔۔ ایسے جیسے عام لڑکیاں مسکراتی ہیں

کوئی اُداس سا ہوا ۔۔ اور میں خاموش

وہ بھی خاموش رہی ۔۔ اور چند لمحے سرک گئے !

میری انگلیاں میری جیب میں رکھے خط سے ٹکرا آئیں اور میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

" یہ خط ۔۔"

" جی ہاں ۔۔ " اس نے میری بات کاٹ دی " اسی کے لئے تو کہہ رہی تھی کہ آپ کے ہاں آنے والی تھی لیجئے یہ رہا آپ کا خط !"

اُس نے سنہرے کناروں والا ہلکے سبز رنگ کا ایک لمبا سا، اکڑا سا لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔۔۔

میرا خط میری جیب میں رہ گیا۔ اور میں حیرت میں اس کا خط کھولنے لگا

" آپ اکثر مجھے کلاس میں چڑایا کرتے تھے " وہ کہہ رہی تھی " کہ ریحانہ اپنی شادی پر کسی کو نہ بلائے گی !"

ایک لمحہ کے لئے میرے ہاتھ کپکپا اُٹھے ۔۔۔

ایک لمحہ کے لئے میرے دل کی دھڑکن بند ہو گئی ۔۔۔

ایک لمحہ کے لئے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ۔۔۔

اور دوسرے ہی لمحہ میں یا کوئی جانے کون بول اُٹھا ۔۔۔ " شکریہ ۔۔ بہت بہت شکریہ !"

اُف ! یہ اندھیرے، یہ تاریکیاں ۔۔۔

کوئی ۔ کوئی ۔ تم کیوں سسک رہے ہو، کیوں رو رہے ہو۔ تمہارا کوئی پیار نہیں، تمہاری کوئی منزل نہیں ۔ اٹھو کوئی گیت لکھو، کوئی گیت گنگناؤ۔ اُداس سا، روتا بکھرتا گیت ۔۔۔

بہکا سا اک سپنا ہوں میں
ٹوٹا سا اک تارا ہوں میں
مجھ سے میرے گیت لے لو۔
مجھ کو اپنا پیار دے دو

جانے کون گنگنانے لگا — شائد کوی یا شائد میں — ہم دونوں میں فرق بھی کیا ہے —

ایک جسم ایک روح !!

شبنم قیوم

بہت اونچے، بہت نیچے

آپ کو میں یہ خط نہائیت ہی رنج و افسوس کے ساتھ لکھ رہا ہوں. یقین کیجئے ہمارا ہوس بوٹ اس وقت ماتم کدہ بنا ہوا ہے ۔ آپ یہاں ہوتے تو ہماری حالت دیکھتے، کاش! اس امانت کے بدلے میری جان چلی گئی ہوتی. میں آپ لوگوں کی امانت کی حفاظت نہیں کر سکا. اس کے لئے میں اب آپ لوگوں کو اپنا یہ ذلیل منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا. آپ انسان کے روپ میں فرشتے ہیں. وہ نیک فرشتے جنہوں نے میری اجڑی نگری بسائی تھی. میری حیثیت کی کایا پلٹ دی تھی. اس کے صلے میں مجھے آپ کی امانت کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرنی تھی. مگر میں اب نہیں کر سکا ۔ اس کا مجھے بے حد افسوس ہے.

کل رات کو گڈ لک GOOD LUCK ہوس بوٹ میں ڈاکوؤں کے ڈاکہ ڈال کر بہت سا قیمتی سامان اور امانت کا بکس لوٹ لیا. میں نے پولیس میں اطلاع دی ہے تاکہ اس کا کھوج نکلے. جونہی مجھے اس کا کچھ پتہ چلے گا میں فوراً آپ کو مطلع کردوں گا.

بدنصیب ۔ رمضان

یہ خط پوسٹ کر کے جب رمضان اپنے بوٹ میں آیا تو اس کا رواں رواں انجانے خوف سے لرز رہا تھا. اس کا دل کانپ رہا تھا. اس کا ذہن تذبذب کا شکار ہو رہا تھا. ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا ۔ اور اسی کیفیت میں وہ خدا سے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی دعائیں مانگ رہا تھا. جسطرح اس کے چہرے پر رنج و غم کی لہریں دوڑ رہی تھیں. اسی طرح خوشی اور مسرت کی انتہا بھی اس کے چہرے سے عیاں تھی ۔ وہ ایک دم کھڑا ہوا اور آگے بڑھا.

ابھی وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ وہ رک گیا اور سوچنے لگا ۔ "کیا میں پولیس کو یہ اطلاع دوں گا؟ پھر تو مجھے ہوس بوٹ کا قیمتی سامان اور امانت کا بکس کسی محفوظ جگہ لینا پڑے گا۔"

اُس نے گڈ لک ہوس بوٹ کے ڈرائینگ روم کا دروازہ کھولدیا۔ اور انداز کرہ وہ صوفہ پر دراز ہو گیا۔

اس نے اس الماری کی طرف کنکھیوں سے دیکھا جسمیں امانت کا بکس تھا۔ دفعتًا اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اس کے ذہن میں سولہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پچیس کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس نے پہلو بدلا۔ تو اس کی نظر اشفاق اور اُس کی بیگم کی تصویر پر پڑی۔ " دو نیک فرشتے ۔ ! " اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کے چہرے پر ایک مُسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ مُسکراہٹ اس کے سامنے ایک کہانی لے آئی۔ جو آج سے چند ماہ قبل اسی ہوس بوٹ کے اسی ڈرائنگ روم میں شروع ہو کر انڈین ایرلائینس کے احاطہ میں ختم ہوئی تھی۔ رمضان نے ایک بار اور اشفاق اور اس کی بیگم کی تصویر کو دیکھا ۔۔۔ یو۔ پی کے یہ دو وزیٹر رمضان کے گڈ لک ہوس بوٹ میں متواتر دس سال سے آرہے تھے۔ اور ایک دو مہینے ٹھہر کر واپس جاتے تھے۔ لیکن اس سال وہ پورے چار ماہ یہاں گذار کر گئے تھے ان چار مہینوں میں انہوں نے رمضان کی دُنیا ہی بدل دی تھی۔ اُسے یاد آگیا ۔۔ آج سے چند ماہ قبل وہ بازار سے سودا سلف لے کر گُڈ لک میں آیا تھا تو صاحب نے اسے ڈانٹتے ہوئے پُوچھا تھا " تم اس وقت تک کہاں تھے تُم نے اتنی دیر کیوں لگادی۔ تُم نے یہ کیا مخول سمجھ رکھا ہے ؟ "

رمضان صاحب کے رویے کو دیکھکر متحیر ہوا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتا صاحب نے غصّیلے لہجے میں کہا تھا " کھڑے کھڑے یہاں کیا کر رہے ہو، چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہاری بوٹیاں نوچ لوں گا۔ "

رمضان سٹ پٹا گیا تھا۔ بیگم کی مداخلت کے باوجود بھی صاحب نے اسے دھکیلتے ہوئے یہاں سے نکالدیا تھا۔ کہ بیگم اس کے پاس آکر متانت سے بولی تھی " رمضانا ! یہ تم کیا کر رہے ہو، اٹھو کرو اپنا کام، پتہ نہیں صاحب کو آج کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو وہ ایسا نہیں کرتا تھا۔ یہ تم کو بھی معلوم ہے۔ تم اس کو کچھ نہ کہنا۔ اسے اندر سے گالی نہیں دینا۔ "

رمضان گلوگیر آواز میں بولا تھا " میں نے صاحب کو کیا کہا کہ اس نے مجھے اس طرح پیٹا۔ آج تک کسی بھی وزیٹر نے مجھ پر ہاتھ نہیں اُٹھایا ہے ؟ "

" میں صاحب کو سمجھادوں گی۔ اٹھو تُم کرو اپنا کام ۔۔ ، اور قسم کھا کر کہدو کہ میں اسے کچھ نہیں کہوں گا۔ گالی نہیں دوں گا ؟ اتنا کہکر اس نے پرس سے پانچسو روپے نکال کر رمضان کو دیئے تھے۔ اور آہستہ سے بولی تھی ۔

" لو یہ میں تم کو دیتی ہوں۔ تُم صاحب کو نہیں کہنا ، اٹھو کرو اپنا کام ؟

بیگم کے واپس جاتے ہی وہ ان سب نوٹوں کو حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ مجھے اتنی بڑی رقم کیوں دی گئی۔ کسی کے پیٹھ پیچھے کسا کچھ نہیں کہا جاتا۔ اگر میں صاحب کو اپنی جگہ بُرا بھلا بھی کہدیتا اور

گالیاں بھی دیتا تو بیگم کو کیا فرق پڑتی جبکہ وہ سُنتی ہی نہیں ہے۔ اس واقعہ کے بعد رمضان بیگم کے سامنے اپنے آپ کو صاحب کے ہاتھوں پٹوانے کے لئے کتنی غلطیاں کرنے لگا تھا۔ مگر صاحب اس کی غلطیوں کو اس طرح ٹال دیتا تھا۔ گویا رمضان اس کے سامنے تین بچوں کا باپ نہیں بلکہ ایک چھوٹا بچہ تھا ــــ ایک روز رمضان چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوا تو اس نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو صاحب کے سامنے نیچے گرا دیا۔ گویا اسے ٹھوکر لگی تھی۔ صاحب اس وقت ایک معمہ حل کرتے میں منہمک تھا۔ ٹی سٹ کے گرنے سے چائے اور دودھ کی چھینٹیں اس کے کپڑوں اور کاغذات کو خراب کر گئی تھیں۔ صاحب نے اٹھ کر رمضان کو کھڑا کیا تھا۔ اور دلاسہ دے کر بولا تھا " کوئی چوٹ تو نہیں آئی ؟ "

رمضان صاحب کے اس ہمدردانہ رویے کو دیکھ کر کچھ مکدر رہا تھا۔ وہ حربے کو ناکام ہوتے دیکھ کر اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ کہ بیگم ڈانٹتے ہوئے بولی تھی۔ " تم دیکھ کر کیوں نہیں چلتے، صاحب کے کپڑے خراب کر دیئے فولش مین ! "

" بیگم ! اسے کچھ نہ کہو، بے چارے کو ٹھوکر لگی ہے "۔ صاحب نے کہا تھا۔ بیگم غصہ ہو کر بولی تھی۔

" یہی بے چارہ کہہ کر آپ نے اسے کندھوں پر چڑھا یا ہے "۔ اتنا کہہ کر وہ رمضان کی طرف بولی تھی۔

" اٹھاؤ یہ برتن اور چلے جاؤ یہاں سے ــــ نان سنس ! "

بیگم کے غصہ کو دیکھ کر صاحب رمضان کا ہاتھ پکڑ کر اسے کچن میں لے آیا تھا اور بولا تھا۔ " رمضانا ! تم ناراض نہیں ہونا۔ پتہ نہیں بیگم کو آج کیا ہو گیا ہے، پہلے تو وہ ایسا نہیں کرتی تھی۔ تم کو بھی معلوم ہے ــــ دیکھو تم اس کو بُرا بھلا مت کہنا۔ ہم اس کو اندر سے گالی بھی نہیں دیتا ــــ میں اسے سمجھاؤں گا "۔

" صاحب میں کسی کو گالی نہیں دیتا ہوں "۔ اس نے متاسفانہ انداز سے کہا تھا۔ " یہ بیگم صاحبہ کا قصور نہیں۔ ہم غریبوں کو سب مارتے ہیں "۔

" ایسا مت کہو رمضانا۔ اگر تم غریب ہے تو تُم نے ہم کو کیوں نہیں بتایا ــــ، لو میں تم کو یہ پانچسو روپے دیتا ہوں۔ تم بیگم کو نہیں کہنا ــــ شاباش ! "

پانچسو روپے پکڑنے کیلئے رمضان اس طرح کھڑا ہوا تھا۔ گویا اپنے کسی کارنامے کا وہ ایک منسٹر سے ایوارڈ پا رہا تھا۔

صاحب کے واپس جاتے ہی وہ جلدی جلدی اپنے بوٹ میں آیا تھا۔ اور بیوی بچّوں کو یہ سارے روپے دکھا کر خوشی سے ناچنے لگا تھا۔ رمضان کی خوشی و مسرت کو دیکھ کر اس کی بوڑھی ماں اور بیوی وزیروں کے ہاتھوں رمضان کو پٹوانے کی دعائیں خُدا سے مانگنے لگی تھیں ــــ ادھر یہ دونوں خدا سے ایسی دعائیں مانگ رہے تھے

اُدھر رمضان اپنی جانب سے کسی غلطی کے سرزد ہونے کے لئے سرگرداں رہا جس غلطی کے عوض اس کی مارپیٹ ہوجائے۔ حالانکہ دانستہ نادانستہ طور پر وہ دن میں کئی کئی بار غلطیوں کا مرتکب بن رہا تھا۔ لیکن ایسی کوئی غلطی نہیں ہو رہی تھی جو اس کو پٹواتی۔

رمضان کے سامنے یہ معمہ حل نہیں ہوتا تھا کہ میری اس طرح ڈانٹ پھٹکار کیوں ہو رہی ہے اور پھر اس ڈانٹ پھٹکار کا معاوضہ کیوں دیا جاتا ہے۔ اب اگر کچھ دیا جاتا ہے تو صاحب کیوں کہتا ہے بیگم کو نہیں کہنا۔ اور بیگم کیوں کہتی ہے صاحب کو نہیں بتانا ــــــ آج تک تو یہاں آتے رہتے ان کو پُورے دس برس ہوگئے۔ ان دس برسوں میں انہوں نے میرے ساتھ کبھی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا۔ اور نہ ہی یہ بڑی بڑی رقمیں بطور انعام یا ڈانٹ پھٹکار کا معاوضہ دیا تھا ــــ کہیں دال میں کچھ کالا تو نہیں ہے ــــ خیر جو کچھ بھی ہوگا مجھے کیا، مجھے تو روپے ملنے چاہئیے، چاہے وہ مارپیٹ کے بعد ہی کیوں نہ ملیں۔

کچھ دنوں کے بعد اس نے ان کے آملیٹوں میں زیادہ نمک ڈالا تھا جن کو چکھتے ہی انہوں نے دونوں پلیٹ جنگل میں پھینک دیئے تھے۔ اور رمضان کی ایسی پھٹکار کی تھی کہ اگر روپے کا معاملہ درمیان میں نہیں ہوتا تو رمضان یہاں سے چلا گیا ہوتا۔ وہ رمضان کو دوسرے آملیٹ لے آنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ لیکن رمضان اس حربے کو ناکام ہوتے دیکھکر مبہوت کھڑا اُنہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ رمضان کی اس حرکت پہ دونوں کو سخت غصّہ ہوا تھا۔ اور یہ غصّہ جب تک رمضان نے اپنے اوپر فرو نہیں کروایا تب تک وہ ایک قدم بھی وہاں سے نہیں ہٹا تھا۔

گڈلک میں یہ شور ہوتے ہی قریب کے بوٹ میں مسرّت کی لہر سی دوڑنے لگی تھی۔ اور ہاتھوں ہاتھوں مزید پانچسو روپے کا حساب جمع ہونے لگا تھا۔ رمضان نے سوانگ بھر کر جب واویلا کرنا شروع کیا تو دونوں نے غصّہ تھوک کر اس کی منّت زاری کی تھی۔ اس سے معافی بھی مانگ لی تھی ــــ غرض وہ کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا جس سے کہ رمضان انہیں معاف نہ کرتا۔ مگر اسے منت سماجت اور معافی کے بجائے مزید ڈانٹ پھٹکار کی ضرورت تھی۔ جس کے بعد اسے روپے مل جاتے۔ اس غرض کے لئے رمضان نے تب تک واویلا جاری رکھا تھا۔ جب تک کہ صاحب نے اسے پانچسو روپے اور بیگم نے پانچسو روپے نہیں دیئے۔ اس طرح ایک ہزار روپے لے کر وہ اپنے بوٹ میں آیا تھا۔ اور بوڑھی ماں، بیوی اور بچوّں کو اس بڑی رقم کے ملنے کی بشارت دے گیا تھا۔

اس واقعے کو ابھی کچھ دن ہی ہوئے تھے۔ کہ رمضان نے ایک روز ان کے لنچ میں جان بُوجھ کر کافی دیر لگا دی تھی تاکہ وہ اس پہ برس پڑیں۔ اور پھر پرس کھولیں۔ مگر وہ دونوں رُوٹھ کر بغیر لنچ کے چلے گئے تھے جس کا بُرا اثر نہ صرف رمضان کی ذات پر پڑا تھا۔ بلکہ اس کی بوڑھی ماں، بیوی اور بچے بھی اس زد میں آ کر

پچھتانے اور ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہنے لگے تھے۔ وزیٹروں کے روٹھ کر جانے کا الزام رمضان بیوی پر ڈالدیتا تھا. مگر اس کی بیوی اپنی ساس کو اس کا قصوروار گردانتی تھی۔ بوڑھی ماں رمضان سے شکایت کرتی تھی تم نے اُن کی شرافت اور نیکی کا ناجائیز فائدہ اُٹھایا۔ اور رمضان اُن پر یہ الزام لگا رہا تھا کہ ایسا کرنے کے لئے تو تم نے ہی میرے کان بھر دیئے۔ اگر میں تمہاری باتوں میں نہیں آتا اور زیادہ لالچ نہیں کرتا تو وہ یہاں سے اس طرح رُوٹھ کر نہیں جاتے۔

اس طرح ایک دوسرے پر اس کی ذمہ داری ڈال کر، ایک دوسرے کو اس کا موردِ الزام ٹھہرا کر جب یہاں تو تو میں میں کے بعد گالی گلوچ تک نوبت پہنچ گئی تھی تو دونوں وزیٹروں کی آمد نے ماتم کدہ کو عشرت کدہ بنا دیا تھا۔

ڈرائینگ روم میں آتے ہی جب انہوں نے رمضان سے اس شور و شر کے بارے میں پوچھا تھا۔ تو رمضان ششش و پنج میں پڑ گیا تھا کہ انہیں میں جواب دوں تو کیا ——؟

دونوں نے رمضان کو تسلّی دی تھی۔ اور یہ ماجرا کہنے کے لئے اصرار کیا تھا۔ رمضان کو اچانک ایک بات سوجھی تھی اور وہ فوراً تیور بدل کر پریشان انداز سے بولا تھا "جناب! آپ نے جو دو ہزار روپے مجھے دیئے تھے ان کو میں بنک میں جمع کرنے جا رہا تھا۔ کہ وہ مجھے راستے میں کھو گئے ۔۔ اسی بات پر ہم سب پچھتا رہے ہیں۔"

اب سنتے ہی دونوں کو سخت افسوس ہوا تھا۔ اور تھوڑی دیر تک پچھتانے کے بعد انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے اسے کہدیا تھا۔

"رمضانا! ہم کل بنک میں تمہارے نام خود ہی دو ہزار روپے جمع کرتے ہیں۔ تم جاکر ان کو کہدو اب وہ شور نہ مچائیں۔

اب سُن کر رمضان یہاں سے بے سر و سامان مسافر کی طرح نکلا تھا۔ لیکن دوسرے بوٹ میں آتے ہی وہ خوشیاں منانے لگا تھا۔

دوسرے روز رمضان کے نام دو ہزار روپے جمع کرنے کے بعد دونوں نے سیر و سیاحت کا پروگرام بنایا تھا۔ اور تقریباً تین ماہ انہوں نے وادی کے تمام صحت افزا مقامات میں گزارے تھے۔ اگرچہ اس سیاحت میں رمضان ان کے ساتھ ایک کتاب کے تین باب بن کر رہا تھا۔ لیکن اس مدّت میں کوئی ایسا واقع پیش نہیں آیا تھا۔ جس واقع میں رمضان کی ڈانٹ پھٹکار ہوتی۔ اور اس کے عوض اسے سینکڑوں روپے مل جاتے حالانکہ اس سفر کے دوران رمضان نے اپنی طرف سے بے شمار غلطیاں کی تھیں۔ مگر انہوں نے ہر بار اس طرح ٹال دیا تھا۔ جس سے رمضان کو روپے کے بجائے ندامت ملی تھی۔

سیر و سیاحت کے بعد جب وہ واپس گڈ لک میں آئے تھے تو رمضان کتنے دنوں تک اپنے آپ کو پٹوانے میں مصروف رہا۔ کتنے حربے وہ اس کے لئے استعمال کر چکا تھا۔ لیکن جب کوئی بھی حربہ کارگر نہیں ہوا تو ان دونوں نے اس کی حرکات کو دیکھ کر اسے اپنے پاس بلایا تھا اور اسے اپنی روانگی کی اطلاع دے کر پورے پانچ ہزار روپے کے ساتھ ایک فہرست بھی دی تھی۔ جس میں گڈ لک کے لئے مزید فرنیچر، نئے قالین اور پردے اور دیگر ضروری سامان درج تھا۔ رمضان نے دو ہزار روپے کے قریب یہ سب سامان لایا تھا۔ اور باقی تین ہزار روپے بغیر کسی حساب کے اسے بچت ہوئے تھے۔

دوسرے روز انہوں نے رمضان کو انڈین ایرلائینس کے آفس تک اپنے ساتھ لیا تھا۔ جہاں وہ اس سے رخصت ہونے سے پہلے ایک چابی دے کر بولے تھے۔

" رمضانا! ہم نے تمہاری الماری میں جو بکس رکھ دیا ہے۔ یہ اسی کی چابی ہے۔ اس بکس کو تم حفاظت سے رکھنا وہ تمہارے پاس ہماری امانت ہے۔ اس کے بارے میں ضروری ہدایات ہم اپنے وطن پہونچکر بھیجدیں گے۔"

رمضان کو اس امانت کو دیکھنے کا بہت اشتیاق جب پریشان کرنے لگا۔ تو ایک روز اس نے الماری میں سے اس بکس کو نکال ہی دیا۔ اور پھر اس کا قفل کھول کر اسے دیکھا تھا۔ بکس کا ڈھکنہ اٹھاتے ہی اس کی آنکھیں چُندھیا گئی تھیں اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے چہرے سے سُرخ لہریں سی اٹھنے لگی تھیں۔ اس کا بدن کانپنے لگا تھا۔ وہ ڈر اور خوف سے کانپ بھی رہا تھا اور خوشی و مسرّت سے باغ باغ بھی ہو رہا تھا کہ وہ ایک دم کھڑا ہوا تھا۔" اور اس روم کا دروازہ مقفل کر کے ساتھ والے بوٹ میں آیا تھا اور غلطاں و پیچاں ہو کر بوڑھی ماں اور بیوی سے مخاطب ہوا تھا۔" —— تم کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہی ہو، جاؤ خُدا سے دعا مانگو، اشفاق صاحب اور اس کی بیگم اب دوبارہ یہاں نہ آئیں۔ وہ بھی ہمیشہ کے لئے —— تم آستانوں پر جا کر منت زاری کر و، دونوں کہیں مر جائیں۔" لیکن جب اس طرح بھی اسے اطمینان نہیں ہوا تھا تو اس نے ان کے نام خط لکھنا ہی مناسب سمجھا جس میں انہیں امانت کے بکس کے چوری ہونے کی اطلاع دی تھی۔

اس خط کو پوسٹ کرنے کے بعد وہ گڈ لک ہوس بوٹ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا اس سوچ میں منہمک تھا کہ میں اس قیمتی سامان اور امانت کے بکس کو کہاں لے کر چھپا دوں گا کہ اسے ایک خط موصول ہوا۔

ڈیر —— رمضانا!

ہم یہاں ٹھیک طرح سے پہونچ گئے۔ اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا تمہیں ہمیشہ

سلامت رکھے، تم کتنے نیک اور بھولے ہو۔ ہم نے تمہارے پاس جو امانت کا بکس رکھدیا ہے۔ اس میں سولہ ہزار روپے ہیں۔ اس لئے اس کی طرف لاپرواہی نہیں برتنا۔ ہم نے تمہارے پاس جو یہ امانت رکھدی ہے۔ اصل میں یہ امانت .... ، تم کو یاد ہوگا یا جب کبھی یاد آتا ہوگا تو نہ جانے ہمیں کیا کیا کہتے ہوگے۔ اور جب کبھی ہمیں یاد آتا ہے تو سخت افسوس ہوتا ہے۔ متواتر دس سال سے ہم تمہیں جانتے ہیں لیکن ان برسوں میں ہم نے کبھی بھی تمہیں نہ پٹیا اور نہ ہی تمہاری بے عزتی کی۔ اس سال جو سلوک ہم نے تمہارے ساتھ کیا اس کا ہمیں افسوس ضرور ہے۔ مگر اُمید ہے تم نے ہمیں معاف کیا ہوگا۔ تمہیں یہ سُن کر شائد تعجب ہوگا کہ ہم آپس میں مشورہ کرکے تمہارے ساتھ ایسا سلوک کرنے کے لئے تمہاری دادی میں آئے تھے۔ ہم نے تمہارے پاس جو امانت رکھدی ہے۔ اصل میں وہ تمہاری امانت ہمارے پاس تھی جب سے سبکدوش ہوکر ہم واپس آئے ہیں۔ آپ کی امانت جو ہمارے پاس تھی وہ پچیس ہزار روپے پر مشتمل تھی۔ نو ہزار روپے تو ہم نے تمہیں اچھے اور بُرے سلوک کے ساتھ لوٹا دیئے۔ باقی سولہ ہزار روپے بکس میں رکھکر چھوڑ آئے ہیں۔ ہم آپ کو یکدم ۲۵ ہزار روپے دے نہیں سکتے تھے کیونکہ اس طرح ہمیں تمہارے شادمرگ ہونے کا احتمال تھا اور اسی لئے ہم نے پہلے ہی یہ مشورہ کیا تھا کہ ہم آپ کو یہ رقم آہستہ آہستہ کچھ اس طرح لوٹا دیں جس سے آپ شادمرگ نہ ہو جائیں۔ اور ہمارا کیا ہوا۔ سلوک اسی بات پر منحصر تھا۔ ورنہ ہم ایسے دیوانے تو نہیں تھے جو تمہیں خواہ مخواہ ڈانٹ پھٹکار بتا کر اتنی بڑی رقمیں انعام میں دیتے۔

رمضانا! تمہاری قسمت بہت اچھی ہے میں اس وقت بھی تمہاری نیت سے ایک معمہ حل کر رہا ہوں۔ اگر اس بار بھی انعام نکلا تو میں اگلے سال بیگم کے ساتھ آکر ضرور تمہارے گدڑلک میں ٹھہروں گا۔ اور تمہارا انعام تم کو لوٹا دوں گا۔

خوش نصیب — اشفاق

JAMMU AND KASHMIR
ACADEMY OF ART, CULTURE & LANGUAGES